انمول موتی

مضامین
مولانا ظفر علی خاں

ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس

انمول موتی

مولانا ظفر علی خان

کے

مضامین کا مجموعہ

حصہ اوّل

مرتبہ

ڈاکٹر صادق حسین ایم۔بی۔بی۔ایس

شائع کردہ۔ ڈاکٹر صادق حسین۔ طور منزل۔ دل محمد روڈ۔ لاہور

بار اول ایک ہزار　　ثنائی برقی پریس امرتسر　　قیمت چھ روپے

ارمغان

ملّتِ بیضاء کے حضور میں
ظفر علی خان جس کا سچا شیدائی تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ہمت بلند دار کہ مردانِ روزگار　　　از ہمت بلند بجائے رسیدہ اند

مولانا ظفر علی خان کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں بلکہ بہت سے پرانے اور نئے سربرآوردہ ان کی نسبت سے متعارف ہوئے ہیں۔ جس کسی کو بھی ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا اور جس کسی نے بھی ان کی زندگی کا مطالعہ کیا خواہ وہ کس قدر ہی سطحی کیوں نہ ہو بلا استثنا یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ مولانا کی ذات مجموعہ صفات تھی۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے قادر الکلام شاعر۔ ادیب اور انشاپرداز ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ خطیب اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ آپ ایک بہت بڑے اور مقبول عوام سیاسی راہنما بھی تھے نہ ایسے جو بنگلوں اور صوفوں پر بیٹھ کر داد سیاست دیتے تھے بلکہ ایک شجاع اور جری سیاسی لیڈر تھے۔ جو ہر اس تحریک میں پیش رو کی حیثیت سے حصہ لیتے تھے۔ جس کی تائید پر وہ کمر بستہ ہو چکے ہوں۔ آپ ایک متبحر عالم دین بھی تھے اور یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے سے پہلے انھوں نے پٹیالہ میں علوم دین کی تحصیل بھی باقاعدہ کر لی تھی۔ اور اسی لئے آپ طالب علمی کے زمانے سے ہی مولوی ظفر علی خاں کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آپ ایک باعمل اور پابند صوم و صلوٰت مسلمان تھے علم اسلام کی آزادی اور سربلندی کے لئے تگ و دو انہیں ہر وقت بے چین رکھتی تھی۔ اور انہیں گھلا یا کرتی رہتی تھی۔ اپنی دانست میں جب کبھی اور جہاں کہیں اس پر زد پڑتی دیکھتے وقت کی تمام مصلحتوں کو یک قلم بھول جاتے۔ اور اسکی مدافعت کے لئے سینہ سپر ہو جاتے۔ یہی اصول ان کی سیاست کی بنیاد تھی۔

ترا چناں کہ توئی ہر کسے کجا داند　　　بقدر ہمت خود می کنند ادراک

برطانوی ہندوستان کی تحریک آزادی کے ہراول دستے کی کمان بھی آپ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ اور اس کی راہ میں جو محیر العقول قربانیاں دینی پڑیں وہ

بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ قرقیاں - جرمانے - پریس کی ضبطیاں، طویل قید و بند کی صعوبتیں آپ کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور ہر ابتلا کے بعد آپ کا نعرہ یہی ہوتا تھا

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کارہا کمتر کنم

صحافت کی پُر خطر اور پُر خار وادی میں جب آپ نے قدم رکھا اور اس کی عزت اور عظمت کو چار چاند لگا دیئے تو اس وقت انگریزی استبداد کی قہرمانیاں اپنی انتہا پر تھیں - انگریز نہ صرف اپنی حکومت اور اپنے تہذیب و تمدن کے خلاف ہی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھا بلکہ یورپ کی کسی قوم پر نکتہ چینی بھی اس کے جوش انتقام کے بھڑکانے کو کافی ہوا کرتی تھی۔ لیکن مولانا کا بے باک قلم بھی ان کو خاطر میں لانے والا نہ تھا۔ اور جب تک انگریز ہندوستان پر قابض رہا اس کا جسم اسکی چبھن سے اغوار ہوتا ہی رہا۔

مولانا حیدر آباد میں تھے اور اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے جو ریاست کے اعلیٰ عہدوں میں سے ایک تھا۔ تو حیدر آباد میں ایک سینما کمپنی آئی ہوئی تھی۔ علی گڑھ کالج کے پرانے طلباء نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک رات کے تماشے کی آمدنی علی گڑھ کالج کے لئے وقف کر دے۔ چنانچہ اس رات تمام ہال امراء اور اعیان دولت اور متوسط درجے کے تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ اطالوی معاشرت کا ایک حیا سوز نظارہ دکھایا گیا۔ کھیل کے خاتمے پر مولانا سے کہا گیا کہ موزوں الفاظ میں کمپنی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ تقریر کے دوران میں مولانا نے مشرقی اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کرتے ہوئے کہیں کہہ دیا کہ اگر ہندوستان کے مردوں اور عورتوں نے بھی اطالویوں کی تقلید کرتے ہوئے بے حیابانہ عمل کرنا شروع کر دیا تو پھر ہمارے ایمان اور اخلاق کا خاتمہ ہے۔ دوسرے ہی دن ریذیڈنسی میں کہرام مچ گیا۔ سر مائیکل اڈوائر ریذیڈنٹ حیدر آباد نے نظام گورنمنٹ سے مطالبہ کیا کہ اس کے ایک عہدے دار نے کل رات علانیہ طور پر مغربی نسائیت پر جو بے باکانہ نکتہ چینی کی ہے اس کی نسبت اس سے سختی کے ساتھ باز پرس کی جائے۔ اس کا جواب اگرچہ مناسب و موزوں الفاظ میں دے دیا گیا۔ لیکن ریذیڈنسی کا غصہ فرو نہ ہوا۔ اور ابھی چند روز گزرنے نہ پائے تھے کہ حیدر آباد دکن سے مولانا

کے اخراج کا حکم صادر ہو گیا۔

مولانا تیرہ سال کی مسلسل ملازمت کے بعد ۱۹۰۹ء میں پنجاب واپس تشریف لے آئے۔ مولانا کے والد بزرگوار مولوی سراج الدین احمد صاحب مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اپنا ہفت روزہ زمیندار جسے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے دیہاتی عوام کی تنظیم اور خدمت گزاری کے لئے نکالا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اپنے لائق فرزند اکبر مولانا ظفر علی خاں کے سپرد کر دیا۔ ؎

لے بس اب میرے نظام زندگی کو بھی سنبھال　　تجھ کو اپنے سے زیادہ معتبر پاتا ہوں میں

مولانا نے جب زمیندار کی عنان ادارت سنبھالی تو اسے کرم آباد سے لاہور لے آئے اور ہفتہ وار سے روزانہ کر دیا۔ روزانہ زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی صرف طبقہ خواص میں محدود تھی جو عام بیداری اور احساس کے پیدا ہونے میں۔ ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ جس کی وجہ سے کوئی تحریک۔ اور کوئی آواز وہ اثر پیدا نہ کر سکتی تھی۔ جس کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن اب زمیندار کی عام مقبولیت کا یہ حال تھا کہ اس زمانے میں اس کی اشاعت بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کے عام فہم ہونے سے اس کی آواز عام لوگوں تک بآسانی پہنچ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہر روز الصبح جب بابا غلام محمد کی آواز آتی "زمیندار اخبار قیمت اک پیسہ" تو ہر وہ شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا تھا زمیندار خریدنے کا خواہشمند ہو جاتا تھا۔

زمیندار نے ابتداء میں ہندوستانی معاملات کے متعلق کچھ نہ لکھا اور مسلمانوں کی سیاسی حالت پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی تاہم اس نے جن معاملات پر لکھا آزادی اور جرأت کے ساتھ لکھا اور اپنے پڑھنے والوں میں یقیناً زندگی کی ایک روح پیدا کر دی۔ اس کے بعد جب اس نے بیرون ہند کے اسلامی مسائل اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کے متعلق لکھنا شروع کیا تو اس آزادی اور جرأت میں سرمو بھی فرق نہ آنے پایا۔

زمیندار مقبول عوام ہونے کے باعث ایک ایسی قوت بن گیا تھا۔ جس کے ذریعہ مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑائی جا سکتی تھی اور دوڑائی گئی۔ اس لئے ضروری ہو گیا

تھا کہ حکومت وقت اس قوت کو ختم کرنے کے حیلے بہانے سوچے اور وہ تمام سرو سامان مہیا کر دے جس سے اس کا مقصد پورا ہو سکے۔ چنانچہ پریس ایکٹ کی شمشیر بے زنہار اس کے سر پہ معلق کر دی گئی پہلے زمیندار سے ایک ہزار کی ضمانت لی گئی۔ یہ مارچ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے اور وجہ یہ ظاہر کی گئی کہ چونکہ اس میں سیاسی مباحث درج ہوتے ہیں اور اس کا لہجہ بسا اوقات نہایت ہی نا ملائم اور قابل اعتراض ہوتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ضمانت نہ طلب کی جائے۔ پھر زمیندار پریس لاہور سے دو ہزار روپے کی ضمانت لی گئی۔ اس کے بعد دس ہزار کی طلب کی گئی اور پھر دس ہزار بھی ضبط کر لئے گئے اور پریس کا تمام سامان اور مشینیں بھی بحق سرکار ضبط ہو گئیں۔

اس موقع پر جرم صرف اس قدر بتایا گیا کہ اجودھیا کے واقعہ عید الاضحٰی پر چند مضامین لکھے گئے تھے جو قابل اعتراض تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۱۳ء کی عید الاضحٰی کے موقع پر ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اور ان کی طرفداری کرتے ہوئے حکومت وقت نے مسلمانوں کو قربانی کرنے سے جبراً روک دیا تھا اور مسلمانوں نے اظہار ناراضی کرتے ہوئے احتجاجاً نماز عید بھی پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ اس سال اجودھیا میں نماز عید الضحٰی ادا نہ کی گئی تھی۔

لیکن دوسرا اور اصل جرم یہ تھا کہ مولانا ظفر علی خاں نے لندن سے ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا جو شائع کر دیا گیا تھا اور اس کا عنوان تھا۔

چار چیز است تحفۂ لندن　　　خمر و خنزیر و روزنامہ و زن

اس مضمون میں انگریزی معاشرت کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا تھا۔ جو ایک ناقابل معافی جرم تھا اور انتہائی تعزیر کا موجب۔

اس سے پہلے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان اور مسجد کانپور کی شہادت پر مضمون شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ دیکھیں مولانا دلوں کو یوں گرمایا کرتے تھے۔ جنگ طرابلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اٹھ۔ "ہاں غیور ترک اٹھ اور ریگ کے درخشندہ ذروں کو خون اعدا سے تر کر دے"۔

پہلی عالمی جنگ میں جب مولانا کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا اور زمیندار کے

نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو مولانا نے نظر بندی کی زنجیروں کو توڑ کر "ستارۂ صبح" کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا۔ اب مولانا نے سیاست کو "دراز کار" قرار دے کر اپنا زر نگار قلم خالص ادبیات کے حسین پیکر تیار کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن حکومت وقت کو آپ کی یہ روش بھی پسند نہ آئی اور اس سے بھی آپ کو مجبوراً قطع تعلق کرنا پڑا۔

اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب تمام سیاسی راہنماؤں کی عام رہائی کا حکم صادر ہوا تو مولانا نے زمیندار کو پھر جاری کیا۔ اب بھی حسب معمول قید و بند کی سختیوں، ضمانتوں کی ضبطیوں، قرقیوں اور جرمانوں اور دیگر ناقابل ذکر وسائل سے زمیندار کو بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن زمیندار۔ ہر ابتلا کے بعد بڑی آب و تاب سے شائع ہوتا رہا اور دنیا کی کوئی طاقت اور تہدید اسے حق گوئی سے باز نہ رکھ سکی۔

اب قوم نے بھی اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور جس قوم کی آواز ہونے کا اسے دعویٰ تھا اس نے کسی قدم پر بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ قوم اس زمانے میں بھی خواص و عوام میں پوری طرح بٹی ہوئی تھی۔ اور ان دونوں طبقوں کے کردار میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لیکن دونوں طبقے اس سے یکساں فائدہ اٹھانے تھے۔ حق کی آواز اگرچہ ایک کے لئے تند و تلخ تھی تو دوسرے کے لئے قند و شہد۔ عوام اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے بس یوں سمجھیں کہ کسی نے آنکھ سے آنکھ ملا کر لیا ہے۔ لیکن خواص کے لئے یہ شجر ممنوعہ کا حکم رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کے مطالعہ سے کبھی جی نہ چرانے مگر لینے تو اس طرح کہ سے

منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

اس مجموعہ کو شائع کرنے سے میرا مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ ان نوادرات کو جو ہمیشہ اخبارات کی زینت ہوا کرتے تھے۔ حوادث روزگار کی تباہ کاریوں سے محفوظ کر دیا جائے۔ یہی وہ مضامین ہیں جن سے مسلمانوں کے دل گرمائے گئے تھے اور ان کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا گیا تھا۔ اور ہاں یہی وہ مضامین ہیں جن کے صدقے اردو کے ہم عصر ادیب اور انشا پرداز آسمان ادب پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے تھے۔

یہ پہلا مجموعہ ہے دوسرے کا انتظار فرمائیں۔

نومبر ۱۹۶۸ء

صادق

فہرست عنوانات

حجتِ حق کا ظہور

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است

خم و خمخانہ با مہر و نشان است

آج کی ساعتِ سعید اُس عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک اپنی نظیر آپ ہے اور اس وقت سے لے کر قیامِ قیامت تک اپنا جواب آپ ہوگا۔ آج دنیا کا وہ سب سے بڑا انقلاب برپا ہوا جس نے دنیا والوں کی کایا پلٹ دی۔ خدائے بزرگ و برتر کی دیرینہ حجت اپنے بندوں پر ختم ہو گئی۔ وہ جیتا جاگتا ارمان جو آذر کے حقیقت شناس بیٹے کے سینے میں مضطرب تھا تڑپ کر باہر نکل آیا۔ وہ زندہ تمنا جو موسیٰؑ عمران اور عیسیٰؑ مریم کے دلوں میں سمائی رہی ساری کائنات میں ایک ہنگامۂ رستخیز برپا کرنے کے لئے آشکارا ہو گئی۔ باطل ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو گیا۔ حق ابدالآباد تک کے لئے سربلند ہو گیا انسان کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں۔ آزادی کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ الست والے بھولے ہوئے میثاق کی تجدید ہوئی۔ مدتوں کا بھاگا ہوا غلام آقا کے قدموں میں آگرا۔ کالے اور گورے کا امتیاز اٹھ گیا۔ اونچ نیچ کا فرق جاتا رہا مسندوں والے اور کملیوں والے ایک بوریئے پر بٹھا دئے گئے۔ خزاں رخصت ہوئی، بہار آگئی۔ رات بیت گئی دن نکل آیا۔ یعنی حضور رحمتِ عالمیاں صفوتِ آدمیاں تتمۂ دورِ زماں محمدؐ مصطفےٰ احمدِ مجتبےٰ بآب ماہو و امہاتنا جلوہ افروز منصۂ شہود ہوئے۔

ہمارے آقائے نامدار آئے اور دونوں جہانوں کی رحمتیں اپنے جلو میں لے کر آئے ابر نیساں کی طرح جس کی لطافت طبع پر چمن اور دمن کا یکساں حق ہے ہمارے حضورؐ کا لطف بے نہایت بھی اپنی آغوشِ رافت کو مشرق و مغرب اور سپید و سیاہ کے لئے ایک سی فیاضی کے ساتھ کھولے ہوئے ہے۔ بلالؓ حبشی اور سلمانؓ فارسی یہاں ایک کانٹے میں تلتے ہیں، مکہ ہو یا ہردوار، مدینہ ہو یا لندن، حضورؐ کی آواز ہر جگہ ایک ہی لے میں گونج رہی ہے اور آواز یہ ہے۔

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا ۝
رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو
فاتخذہ وکیلا ۝

اپنے پروردگار کے نام کا ورد کر اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہ۔ وہ مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی لائق عبادت نہیں، پس تو اسی کی کارسازی کا دامن تھام لے۔

جن سعیدانِ ازلی نے اس آواز پر کان دھرا اور ماسوا سے رشتہ توڑ کر آواز بلند کرنے والے کی طرح اپنے اللہ ہی کے ہو رہے، اُن کے عالم افگن کارناموں پر گزشتہ تیرہ صدیوں کی تاریخ گواہ ہے۔ اس آواز میں اب بھی وہی اثر ہے اور اگر دل کے کان اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو تاریخ اپنا اعادہ کرنے میں ذرا تامل نہ کرے گی اور حضور خواجۂ دوسراؐ کے غلام آج کل کے قیصروں اور کسراؤں کے تخت ازسرنو اُلٹتے ہوئے دیکھے جائیں گے۔

ہمارے آقا و مولاؐ جب دنیا میں تشریف لائے تو بالکل اکیلے تھے، صرف رفیق الاعلیٰ ساتھ تھا کہ وہ بہترین رفیق ہے۔ اسی رفاقت کے بل پر حضورؐ نے یکہ و تنہا سارے عرب کو مسخر کر لیا اور جب دنیا کا یہ سب سے بڑا گلیم پوش تاجدار جو ایک ہی وقت میں فقیر بھی تھا اور بادشاہ بھی، عابدِ شب زندہ دار تھا اور افواجِ جرار کا سپہ سالار بھی ابجد ناشناس بھی تھا اور فلسفیانِ عالم کا ادب آموز بھی، مجسمہ جمال بھی تھا اور پیکرِ

جلال بھی سونے چاندی کے انباروں سے گھرا ہوا بھی تھا اور پیٹ پر پتھر باندھ کر کئی کئی دن تک فاقہ کرنے والا بھی تیئیس سال کی قلیل مدت میں مفاسد کو زیر و زبر کر کے رہگرائے عالم جاودانی ہوا تو اپنے جاں نثاروں کو یہ پیغام دیتا گیا۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت
لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف
الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم
الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد
خوفھم امنا

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں اُن کے ساتھ خدا کا پختہ وعدہ کہ وہ انھیں روئے زمین کی سلطنت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح اگلی امتوں کو عطا ہوئی اور اس دین (اسلام) کو جو اُن کے لئے پسند کیا گیا ہے پائندہ واستوار بنائے گا اور ان کے خوف کو امن وامان سے بدل دے گا۔

یہ اٹل اور امٹ پیغام مسلمانوں کی فرمانروایانہ حیثیت کے لئے بارگاہِ رب السمٰوٰت والارض سے ایک جاودانی سند ہے۔ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان جن کی تعداد سے بدر کے تین سو تیرہ جانبازوں کو کوئی نسبت نہیں اس وعدہ الٰہی کے الفاظ پر غور کریں۔ اپنے آقا و مولا کی حیات طیبہ کے ایک ایک واقعہ سے سبق لیں اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب دے لیں کہ اس ملک میں جہاں وہ ہزار سال تک نقارہ اناولاغیری بجا چکے ہیں کم از کم عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کا سامان کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ یہ نہ کریں تو پھر آج کا دن جو اُن کی ہستی کا آسمانی دیباچہ ہے اُن کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فتدبر و

روزنامہ "زمیندار" ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء

موتیوں کی لڑی

موتیوں میں کیسی لطیف آب و تاب ہوتی ہے۔ مگر جنس لطیف کی سیرت و سریرت (کیرکٹر) کی تابانی و درخشانی ان پر بھی فائق ہے کہ صدف کے موتی اگر آویزۂ گوش بننے کے لئے ہیں تو یہ شرف کے موتی آویزۂ عقل و ہوش بننے کے لئے ہیں۔ صدف کے موتیوں نے اگر بڑی ترقی کی تو فرعون کی سفید ڈاڑھی میں پرو دئے گئے۔ لیکن شرف کے موتی اگر تنزل میں بھی رہے تو موسےٰ (علیہ السلام) کو فرعون کی بے سبب آزاری سے بچایا گئے۔ عربی مذاق اسی لئے شریف عورتوں کو "لولیۂ اشرف" (شرافت کے موتی) کا خطاب دیتا ہے کہ یہی تابدار موتی نظم و نظام عالم کی آرائش ہیں۔ اور یہی وجہ مناسبت ہے کہ نسائیات کی یہ سلک گوہرین اپنے لئے "موتیوں کی لڑی" کا عنوان تجویز کرتی ہے کہ دنیا کی نامور عورتوں کے روشن ترین سوانح زندگی اس لڑی میں منسلک ہیں۔ آج اس حلقہ کا افتتاح ہم اس ذات پاک سے کرتے ہیں جسے قدرت کاملہ نے دنیا بھر کے ایمانداروں کی ماں ہونے کا خطاب دیا تھا۔ اور جس کی نورانی حیات ایمانی واقع میں ہر ایماندار سر کے لئے دُرَّۃُ التَّاج کرامت ہونے کا سچا استحقاق رکھتی ہے۔

اس دولت مند خاتون کی حالت کا اندازہ کرو جس کا سلسلۂ تجارت عرب سے شام تک وسیع ہے۔ بہت بڑے خدم و حشم کی مالک ہے، بیوہ ہے، عمر بھی ڈھل چکی ہے کہ ایک نوجوان کے صدق و صفا و دیانت و امانت کا آوازۂ حق اس کے گوش زد ہوتا ہے اور وہ اسے متاعِ تجارت کا قافلہ سالار بنا کر ارض شام کو بھیجتی ہے۔ یہ نوجوان سفر شام سے واپس آتا ہے اور صبح سعادت ساتھ لاتا ہے

خاتون اس کی راست بازی و راست کرداری کی گرویدہ ہو جاتی ہے اور شادی کا پیغام دیتی ہے مگر وہ اسے نامنظور کرتا ہے کہ "ہنوز ایسے تعلقات میرے حسب حال نہیں" خاتون اس کو مجبور کرتی ہے کہ "جو دولت مجھے حاصل ہے وہ پھر تمہاری ہو جائے گی تم اس سے خستہ خاطروں کی چارہ گری کر سکو گے بیواؤں کو مدد دو گے یتیموں کی اشک شوئی کرو گے۔ اور قوم کی حالت کو بہتر بناؤ گے۔ لہذا انکار کے دوسرے معنی اس تحریک اصلاح کی توسیع ترک کر دینے کے ہوں گے جس کا سلسلہ میری بدولت جاری ہو سکتا ہے"۔

یہ جائز ترغیب کہ رفاہِ ذات پر مبنی نہ تھی بلکہ تمامتر فلاح کائنات پر مبنی تھی۔ نوجوان میں آمادگی پیدا کر دیتی ہے اور وہ رضامند ہو جاتا ہے۔ خاتون کو اب اپنے باپ کی رضامندی حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے جو اس وقت کی حمیت، جاہلیت کا نمونہ ہے۔ ایک بزم ضیافت ترتیب دی جاتی ہے جس میں نوجوان اور اس کے خاندان کے دوسرے سرداران قوم مدعو ہوتے ہیں۔ قربانیاں ہوتی ہیں، جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ خاتون کا باپ میر مجلس بنتا ہے۔ جسے خاتون کے اشارے سے متواتر اس قدر شرابیں پلاتے ہیں کہ وہ بدمست ہو جاتا ہے اس حالت میں نوجوان کی جانب سے ایک ردای زعفرانی پیش کی جاتی ہے کہ یہی علامت نکاح ہے۔ وہ اسے منظور کر لیتا ہے اور یہی منظوری رسم نکاح کی تکمیل ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد جب اسے ہوش آتا ہے تو برہمی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کارستانی خود اس کی بیٹی کی ہے تو خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اب اس خاموشی سے نکاح کے ناحق ہونے میں کوئی کلام نہیں رہ جاتا۔

نکاح کے بعد اس نوجوان کے دن غریبوں کی دستگیری میں کٹتے ہیں۔ اور راتیں عبادت میں بسر ہوتی ہیں۔ آبادی سے باہر ایک غار اس کا خرقۂ اعتکاف ہے جہاں بیٹھ کر قدرت کی نشانیوں میں وہ غور کیا کرتا ہے اور اس عبادت و اعتکاف میں بسا اوقات یہ بلند ہمت خاتون بھی اس کے شریک حال رہا کرتی ہے کہ بیوی کی

صفائی قلب بھی خاوند کے شرح صدر ہی کے سینہ بہ سینہ ہے اور دونوں کی روحانیت اسی ناموس فطرت کا آئینہ ہے ۔

روحانی ترقی کی کیا کچھ قابلیت اس عورت میں موجود ہوگی جو تزکیۂ باطن و تہذیب بھی میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے اور پورا ساتھ دیتی ہے ۔

(۱) اس کی شادی کی عمر نہیں ہے ۔ ۴۰ برس کا سن ہے ۔ شباب ڈھل چکا ہے کہولت کے دن ہیں جن کے ساتھ پیرانہ سالی کی آمیزش ہوا ہی چاہتی ہے ۔ اس حالت میں وہ اپنے لئے ایک شوہر منتخب کرتی ہے ۔ جو یتیم ہے گھر بار نہیں رکھتا مال و منال نہیں رکھتا ۔ میر قبائل نہیں ہے ۔ مطاع ملت نہیں ہے ایک عزلت پسند شخص ہے جو اپنی قوم کے عقائد و اعمال سے بھی بیزار و متنفر ہے ۔ فقط رفاہِ عام اس کا نصب العین ہے اور اسی نصب العین کے ماتحت اس کے سارے کام ہوتے تھے راست کرداری و امانت شعاری کے ساتھ اس قدر شغف ہے کہ جس قوم کے طرز عمل سے وہ علانیہ نفرت کرتا ہے وہ بھی "الصادق الامین" اسے کہتی ہے ۔ خاتون کا یہ انتخاب کسی ذاتی آسائش کے لئے نہیں ہے کیونکہ ان جذبات کے دن سن نہیں رہے کسی وجاہت کے لئے نہیں ہے کیونکہ یہ خود اس کو حاصل ہے ۔ مال و دولت کے لئے نہیں ہے ۔ کیوں کہ جس کو انتخاب کرتی ہے وہ کوئی سرمایہ نہیں رکھتا ۔ صرف منتخب کے اوصاف حسنہ یہ انتخاب کراتے ہیں کہ اس ذریعہ سے قوم کو فلاح ہوگی ۔ اور تحریک اصلاح بہ آسانی کامیاب ہوسکے گی ۔

(۲) عورتیں کسی عمر کی ہوں گی طبعاً مال و دولت کے ساتھ مردوں کی نسبت زیادہ شغف رکھتی ہیں لیکن اس خاتون کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اپنا سارا مال و زر شوہر کے حوالہ کر دیتی ہے ۔ جو اسے حاجت مندوں کے کام میں لاتا ہے اور بطریق مناسب مستحقین کی اس سے اعانت کیا کرتا ہے کہ خیر کم من یرجی خیرہ (بہترین آدمی وہی ہے کہ لوگ اس کی بہتری اور بھلائی کے امیدوار رہیں)

(۳) خاوند کی فطری استعداد اس پر کائنات کے راز کھول دیتی ہے زمین و آسمان

کے پروے اٹھ جاتے ہیں۔ بغیر سابقہ معرفت کے پہلے پہل ناموس فطرت سے اس کا سابقہ پڑتا ہے جس کی پہلی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ خدا کا نام لے کر تعلیم کے لئے مستعد ہو جائیے۔ وہ اپنے تعلیم یافتہ نہ ہونے کا عذر کرتا ہے کہ میں تو امی (ان پڑھ) ہوں مگر یہ عذر پیش نہیں جاتا اور پھر تعلیم ہی کی تاکید ہوتی ہے۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق ہ اقرأ و ربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم (اپنے اس پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ اپنے اس پروردگار کا نام لے کر پڑھو جو نہایت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی۔ جس نے انسان کو وہ ساری باتیں سکھائیں کہ انہیں وہ جانتے بھی نہ تھے)

اس پاک روح کے لئے عمر بھر میں یہ پہلا سبق ہوتا ہے جس سے وہ گھبرا جاتی ہے غار سے گھر واپس آتی ہے۔ اور بیوی سے تاکید ہوتی ہے کہ "مجھے اڑھاؤ کہیں میں ہلاک نہ ہو جاؤں"۔ بیوی کپڑے اڑھاتی ہے تسلی و تشفی دیتی ہے۔ ہمت بندھاتی ہے۔ اور واقعہ سن کر اطمینان دلاتی ہے کہ "خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم خدا آپ کو ذلیل نہ ہونے دے گا۔ کیونکہ

(۱) آپ اپنے رشتہ داروں کے ہمدرد ہیں۔

(۲) آپ ہمیشہ سچ بولتے ہیں اور سچائی برتتے ہیں

(۳) آپ مصیبت زدوں کے دکھ درد میں حصہ لیتے ہیں۔

(۴) غریبوں پر رحم کرتے ہیں۔

(۵) مہمانوں کی تواضع و خاطر داری میں سرگرم رہتے ہیں۔

(۶) اور ہمیشہ نیک تحریکوں میں شریک ہوتے ہیں۔

(۷) بیوی جاتی ہیں خاوند کی داستان اپنے ایک عیسائی رشتہ دار کو سناتی ہیں اور اسے ساتھ لاتی ہیں۔ یہ شخص توراۃ و انجیل کا عالم ہے واقعہ کے سنتے ہی اسے پیغمبر بنی اسرائیل المسیح ذالسیعیاہ کے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں جو اسفار توراۃ کے

مجموعۂ حاضرہ میں آج بھی موجود ہیں اور صحیفہ یسعیاہ کے انتیسویں باب کی بارھویں آیت میں یوں مرقوم ہیں۔

"وہ کتاب ایک امّی (ان پڑھ) کو دیں گے اور کہیں گے کہ آپ اسے پڑھیئے اور وہ کہے گا کہ میں تو ناخواندہ ہوں میں پڑھ نہیں سکتا"

یہ آسمانی نشانی کیا پیش نظر ہوئی کہ عہد عتیق وجدید کی تمام پیشگوئیاں سامنے آگئیں۔ جو انبیائے بنی اسرائیل نے نبی موعود کے حق میں کی تھیں۔ اس نے فوراً مان لیا کہ وہ نبی موعود یہی ہے اور یہ وہی ناموس تجھ پر نازل ہوا ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوا کرتا تھا۔ کاش میں جوان ہوتا۔ طاقتور ہوتا۔ اس وقت تک زندہ رہتا جب تجھے تیری قوم نکال دے گی۔ نوجوان جب اس پر متعجب ہوتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ "ہاں۔ یہی بات ہے جب کبھی کسی پیغمبر نے ایسی صاف تعلیم پیش کی ہے جیسی تو کرے گا تو لوگ اس کے مقابلہ کو اٹھے ہیں اور ہمیشہ اسے اذیت پہنچائی ہے۔ وہ دن اگر مجھے ملے تو میں تیری بڑی مدد کروں گا"

خاتون اس ماجرا کو سنتی ہے اس پر غور کرتی ہے اور ایسے وقت میں خدائے وحدہٗ لاشریک لہ پر ایمان لاتی ہے کہ اس کے برگزیدہ پیغمبر کے علاوہ دنیا بھر میں کوئی ایک ایماندار بھی نہ تھا۔

(۵) کچھ دنوں کے بعد جب یہ نفس قدسی حسب منشائے تعلیمات قدرت اپنی سفارت سماوی کا حق ادا کرتا ہے اور زمین کو آسمان کا پیغام سناتا ہے تو خود اس کی قوم دشمن ہو جاتی ہے۔ ایذائیں پہنچاتی ہے اور ہر طرح ستاتی ہے۔ ایسے وقت میں یہی خاتون ہے جو خاوند کے کام آتی ہے۔ اس کی ڈھارس بندھاتی ہے اور خدا کی راہ میں اس پر نثار ہو جاتی ہے۔

(۶) پچیس برس کے سن میں اس نفس قدسی نے نکاح کیا تھا جب کہ بیوی کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو چلی تھی۔ پورے پچیس سال اسی ایک بیوی کے ساتھ بسر کئے جس نے ۶۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ جب کہ خاوند کی عمر ۵۱ برس کی تھی۔ اس زمانہ

میں معاند بن اس کو جادوگر کہتے رہے۔ مصروع کہتے رہے کاہن کہتے رہے مجنون کہتے رہے۔ شاعر کہتے رہے۔ لیکن یہ بیوی تھی جس نے ساری قوم کی مخالفت گوارا کر لی۔ سب سے ترک تعلق کر لیا۔ سب کی ایذائیں سہیں۔ مگر اپنے پاک نفس خاوند کو دل سے پیغمبر سمجھتی رہی اور اس کے کام میں بقدر مقدور امداد کرتی رہی۔

(۷) خاوند کو خانہ بدر ہونا پڑتا ہے۔ خاوند کے ساتھیوں کو ملک بدر ہونا پڑتا ہے۔ اس کو خدا کے گھر میں عبادت نہیں کرنے دی جاتی۔ اس کو خدا کا پیغام نہیں سنانے دیا جاتا۔ اس کے ارادت مندوں کو سخت سے سخت سزائیں ملتی ہیں۔ اس کے قتل کی سازشیں ہوتی ہیں۔ اس کا خاندان برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے سب کچھ ہوتا ہے اور سب کچھ ہونے کی طیاری ہے۔ مگر جب سب کے جواب میں اس کی زبان سے یہی ایک کلمہ نکلتا ہے کہ "یہ لوگ آفتاب کو اگر میرے داہنے ہاتھ پر لا دھریں اور ماہتاب کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں۔ جب بھی وہ مجھ کو میرے کام سے ہٹا نہ سکیں گے۔ میں تبلیغ حق سے ہرگز نہ رکوں گا۔ یہاں تک کہ میرا خدا اسی حق کو ثابت کر دے گا۔ یا میں اسی اعلائے حق کی کوشش میں فنا ہو جاؤں گا" تو یہی بیوی ہے جو سب سے پہلے اس کلام کی تائید کرتی ہے۔ اور جان و مال سے پوری پوری تائید کرتی ہے۔

جانتے ہو یہ میاں بیوی کون تھے؟ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زوجۂ مطہرہ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ جو نشر و اشاعت و تقویت و تبلیغ اسلام میں آخر وقت تک آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریک رہیں۔ آسمان کی یہ سب سے بڑی عالمگیر تحریک اصلاح (اسلام) جس کے ماننے والے روئے زمین کے کم سے کم تیس کروڑ انسان اس وقت موجود ہیں۔ اس کی صداقت کو سب سے پہلے تسلیم کرنے والی اور اس کی ترقی میں عمر بھر کوشش کرتی رہنے والی یہی پاک ذات بیوی تھیں۔ جو دنیا بھر کی نیک نفس بیویوں کے لئے اپنا پاک نمونہ چھوڑ

گئی ہیں۔ کہ وہ بھی انہیں کے نقش قدم پہ چلیں۔ اور اپنے آپ کو نیک وسعید والوالعزم وطاہر القلب وجویای صداقت خدمت گزار حق وعدوی باطل بنانے میں جدوجہد کریں۔ ایسی عورتوں کو مردوں پہ ہزار درجہ شرف حاصل ہے۔ جو قانون الٰہی کی تائید میں عورت ہو کر مردوں پہ سبقت لے جائیں اور مردوں سے بڑھ کر اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کا تابع بنائیں۔

"فما التانیث لاسم الشمس عیب"

(آفتاب کے نام کے لئے جو عربی میں مونث ہے تانیث سے کوئی منقصت نہیں ہو جاتی)

"ولا التذکیر فخر للهلال"

(اور نہ ماہتاب کے نام کے لئے جو عربی میں مذکر ہے تذکیر کوئی وجہ فخر و ناز ہو سکتی ہے۔

فلو کان النساء کمن ذکرنا

(ہم نے ابھی ابھی جو واقعہ بیان کیا ہے اگر اسی شان کی عورتیں ہوا کریں)

لفضلت النساء علی الرّجال

(تو عورتوں کو مردوں پہ کہیں فضیلت و برتری حاصل ہے)

ہفت روزہ "ستارہ صبح"

۱۲ر نومبر ۱۹۱۷ء

ترجمان القرآن

(۱)

"فقد ہار البود آیا کہ عیارے گیرند"

کیا ہنوز وقت نہیں آیا کہ اسلام اور اساس کی کامل العیار حقیقت وحقانیت کا ایک معیار عمل ہو کہ ہمارے تمام معاملات ومختلفات اسی پر پیش کئے جائیں اور اسی کے مطابق سب کا تصفیہ ہو سکے؟ پھر کیا ایسا معیار اس قانون آسمانی کے علاوہ کوئی اور ہو سکتا ہے جسے اسلام وایمان نے خود اپنے لئے دستور اساسی (کانسٹیٹیوشنل لا) قرار دیا ہے جو موعظت ہے شفاءٌ لما فی الصدور ہے بے راہ روؤں کے لئے ہدایت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دنیا میں جو کوئی بھی ایمانداری کی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے اس کے لئے موجب رحمت وبرکت ہے۔ تم کوئی کام کرو کسی شغل میں رہو۔ اس کے ستقم وصحت کی جانچ منظور ہے تو اسی معیار سے جانچو پھر کوئی اشتباہ نہ رہے گا۔ فرعیات کی سطح سے بلند ہو کر اصول وآئین کی خشت نشین پر آنا ہے تو اس عروۃ وثقی کو مضبوط پکڑو، حبل اللہ المتین سے تعلق پیدا کرو، قدر مشترک کو لے لو اور اپنے آپ کو اسی جامعہ محکمہ کے ماتحت رکھو۔

تا ہمہ صومعہ داراں پے کارے گیرند

(۲)

"انزل القرآن علی سبعۃ احرف" قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے وہ حرف نہیں جو فقل ابجد کھوتے ہیں اور جن سے مرزا غالب کے نصیبوں میں بات کے بنتے ہی جدا ہونا مقسوم تھا۔ یہ وہ حرف ہیں جن کی تشریح (بروایت عبداللہ بن مسعودؓ) خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور پھر ان کی تقسیم بھی کر دی ہے۔ کہ قرآن ذیل کے سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔

(۱) زجر و توبیخ (۲) اوامر و احکام (۳) حلال
(۴) حرام (۵) محکم (۶) متشابہ (۷) قصص

ان سب کے متعلق آنحضرت سلام اللہ کی تعلیم یہ ہے کہ احلوا حلالہ وحرموا حرامہ وافعلوا ما امرتم بہ وانتھوا عما نھیتم عنہ واعتبروا بامثالہ واعملوا بمحکمہ وامنوا بمتشابہہ وقولوا امنا بہ کل من عند ربنا (قرآن نے جسے حلال بنایا ہے اسے حلال رکھو جو حرام ہے اسے حرام جانو جو حکم دیئے ہیں ان پر کاربند ہو۔ جن سے روکا ہے ان سے باز رہو۔ جو مثالیں اور حکایتیں بیان کی ہیں ان سے عبرت حاصل کرو۔ جو محکم و استوار صاف صاف آیتیں ہیں ان پر عمل کرتے رہنے سے کبھی پیچھے نہ ہٹو کہ رسوخ فی العلم کے بعد کوئی شبہ نہ رہ جائے گا۔ کوئی بات متشابہ نہ رہے گی اور کہو کہ ہم اس پہ ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے)

یہی ساتوں حروف ہیں جن کے متعلق تذکیر کرتے رہنا ہمارے مضمون کا اصلی موضوع ہے۔ اصل میں اس مضمون کی حقیقت قرآن کریم کے ایک سادہ ترجمہ سے زائد نہ ہوگی لیکن یہ ترجمہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے ماخوذ ہوگا کہ ہر ایک آیت کو وہ کیونکر سمجھے تھے اور اس کے ماتحت کیسی زندگی بسر کرتے تھے اس سلسلے میں انشاء اللہ قرآن کریم کی پوری تفسیر بھی ہوتی رہے گی جس کے تمام حلقے انھیں حروف پر مبنی ہوں گے۔ تمام کڑیاں اسی سے ہمارے اٹھینگی۔ "تفسیر" کی کڑیوں کے لئے تو "دیوانے کا پاؤں" درمیان تھا یہاں تو "الذکر الحکیم" کی کڑیاں ہیں۔

قرآں کا پاؤں درمیاں ہے

۳

"طاہر دولت اگر باز گزارے بکشد"

یہ ایک آرزو تھی ایک متوسط آرزو تھی جس کا آرزومند فقیر نہ بھی تھا۔ اور

ہندوستان بھی ہے۔ غیرانہ نے تو حسن عشق کے یارانہ رنگ میں اس آرزو کو پیش کیا تھا لیکن ہندوستان کو، اسلامی ہندوستان کو اگر کسی کی یاری مطلوب ہے تو قرآن سے بہتر اس کو دوسرا یار کون مل سکتا ہے اگر ذوق حسن وعشق سے لذت گیر ہوتا ہے تو قرآن سے شیریں تر کس کی ادائیں حسن دل آویز رکھتی ہیں جس کے عشق سے مسلمان تو خالی ہیں مگر زمین وآسمان خالی نہیں ۔ تم اسی قرآن کو اپنا "یار" بناؤ اسی سے یاری رکھو اسی کے طالب وصل "رہو دل ودماغ" تو اسی "طائر دولت" کے نشیمن ہوں ۔ سینے ہوں تو اس کے زگنرہ ہوں کہ یہ شاہ باز حقیقت واقع میں طائر دولت ہے ۔ یہ آجائے تو دولت بھی آجائے گی ۔ اور کونسی دولت قرآن سے بڑی ہے کہ یہ گنجینۂ کائنات تمہارا یار ہو اور اس کے وصل کا تم سے قول وقرار ہو ۔

یار با ز آید و با وصل قرار ست کند

"دوش گفتم بکند لعل لبت چارۂ دل ؟

"کیا قرآن سے مسلمانوں کی چارہ گری ممکن نہیں کیا امراض اجتماعی کا اس سے بہتر بھی کوئی چارہ ساز ہے ۔ شاید ترقی پسند طبیعتیں تنزل کے رنگ میں اس کا کچھ اور جواب دیں مگر تاریخ کا جواب تو ایک ہے اور صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جس پر خیر القرون کی زندگی مبنی ہے ۔ یہ زندگی قرآن ہی سے حاصل ہوئی تھی اور اب بھی حاصل کرنا چاہو تو لسان الغیب کی پیش گوئی دلیل راہ بن سکتی ہے جو معالج قدرت قرآن کی چارہ گری کے متعلق صدیوں سے منادی کر رہی ہے ۔

ہاتف غیب ندا داد کہ آرے بکند

۴

قرآن کی یہ تفسیر یا ترجمہ جیسا کچھ بھی ہوگا اہل نظر اس کا اندازہ خود کر لیں گے ۔ ابھی ہم اس باب میں کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن اصول کی باتیں دیر تک تاب مستوری نہیں رکھتیں ۔

چو دِہ بندی سراز مرد زن برآرد

وہ اصول کی بات تو ہے مگر کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ تیرہ صدیوں سے بھی زیادہ

پرانی بات ہو چکی ہے جس نے محمد بن بشار ہو دل، سفیان، ابوالزناد کے ترتیبی واسطوں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔

التفسیر علی اربعۃ وجوہ

قرآن کریم کی تفسیر چار قسموں پر منقسم ہے یعنی چار طرح پر تفسیریں ہو سکتی ہیں یا ہوتی ہیں۔

(۱) وجہ تعرفہا العرب من کلامہا

تفسیر کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آیات قرآنی کے مطالب و معانی اہل عرب اپنی زبان (عربی) اور اس کے انداز کلام و سیاق ترکیب سے سمجھ لیتے ہیں۔

(۲) وتفسیر لا یعذر احد بجہالتہ

دوسری قسم کی تفسیر وہ ہے جس سے ناواقف و بے خبر رہنے میں کسی کو معذور نہیں رکھا جا سکتا یعنی اس کا جاننا ہر شخص کا فرض ہے اور نہ جاننے کی صورت میں کسی حیلہ و بہانہ سے مخلصی نہیں ہو سکتی۔

(۳) وتفسیر یعلمہ العلماء

تیسری تفسیر وہ ہے جسے اہل علم جانتے ہیں۔ یعنی عوام کو اس کے لطائف و معارف سے کوئی سروکار نہیں۔

(۴) وتفسیر لا یعلمہ الا اللہ

آخری تفسیر وہ ہے جس کا علم خدا ہی کو ہے۔

ہماری تفسیر صرف اول و ثانی تک محدود ہو گی۔ یعنی کلام عرب کے مطابق آیات زیر تفسیر کا مطلب کیا نکلتا ہے اور اس میں کیا کیا باتیں ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے لازم ہے۔ خدا ہی توفیق دے اور اپنا کام پورا کرائے۔ ورنہ یہ راہ ایسی نہیں کہ پائے لنگ سے طے ہو سکے یا دست کوتاہ کی رسائی میں یا کورہ قدرت آ سکے۔

ربنا ارنا الحق حقاً وارنا الباطل باطلاً

وارنا الاشیاء کما ھی

دیدہ را دستگہ دُرّ و گہر گرچہ نماند
بخورد خوفے و تدبیر نثارے بکند
شہر خالی است زعشاق بگر کز طرفے
دستے از غیب بروں آید و کارے بکند

۵

قرآن کریم کیا اسی لئے نازل ہوا ہے کہ رنگین کپڑوں کے تہ بہ تہ جزدانوں میں لپیٹ کر گھر کے سب سے بلند طاقچے یا الماری کے اوپر والے خانے میں رکھا رہے طوطے مینے کی طرح اس کی آیتیں اور سورتیں زبانی رٹ لی جائیں جن کی کانفرنسوں کے افتتاح اجلاس کے وقت تلاوت ہو سکے۔ قاری تجوید کر رہا ہو اور سامعین ٹوپیاں ہاتھوں میں لئے ننگے سر کھڑے ہوں کہ قرآن کا مجید و کریم سر برہنگی کی داعی ہے۔ اقامت لغیر الصلوٰۃ کی داعی ہے نغمہ و تغنی و خوش الحانی کی داعی ہے۔ تراویح و شبینہ پڑھا سکنے کی داعی ہے۔ اموات کے لئے ختم شریف (فاتحہ) کی داعی ہے غرض کہ ہر ایک بات کی داعی ہے۔ اگر نہیں ہے تو تدبر و تفکر کی داعی نہیں ہے اور اگر قرآن میں غور و فکر ضروری بھی ہو تو اس ضرورت کی کائنات اسی قدر ہے کہ مثلاً

(۱) جن و شیطان کی ہستی و نیستی کے اقرار یا انکار کے لئے آرائش استدلال کا کام دے سکے۔

(۲) بطالت آرائی کے لئے خواب و خیال کے اثبات یا ابطال میں قرآن سے مدد لی جائے۔

(۳) وضو و غسل و حیض و نفاس و قردود طہر یا ایام ثلٰثہ میں بحث ہو سکے۔

(۴) علم و اسلام کی تضحیک کے لئے اپنی رائے کے مطابق آیات الٰہی کی تاویل کی جائے۔

اور جو بات عقل ناقص میں نہ آئے اس سے فی الفور انکار کر دیا جائے۔

مرزا غالب کو تو سارے اوامر قرآنی میں سے "کلوا واشربوا" دلنواز میں سے

"لاتقربوا الصلوٰۃ" ہی یاد تھا مگر ہم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے تمام قرآن سے ہنگامہ افروزی کے لئے صرف ایک آیت منتخب کرلی ہے کہ اِنّ اللّٰہ لا یغیر ما بقومٍ حتّٰی یغیروا ما بانفسھم۔

۶

لیکن یہ باتیں حقیقت سے کس قدر قریب یا بعید واقع ہوئی ہیں قرآن ہی اس کا جواب دے گا۔ اور اپنی غرض آپ بیان کرے گا۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

کتابٌ انزلناہ الیک مبارکٌ لیدبّروا
اٰیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب ۔

ہم نے تمہارے پاس یہ برکت والی کتاب اتاری ہے کہ لوگ اس کی نشانیاں (آیتیں) سوچیں سمجھیں تدبر کریں اور دوسری غرض یہ ہے کہ اہل ہوش وفطانت اس کی تذکیر کریں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے ۔

ولقد ضربنا للناس فی ھٰذا
القراٰن من کل مثلٍ لعلھم یتذکرون

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں دی ہیں شاید وہ تذکیر کریں

پھر ہدایت فرمائی ہے ۔

قراٰناً عربیاً غیر ذی عوجٍ
لعلھم یتقون ۔

یہ فصیح عربی قرآن ہے اس میں کوئی کجی نہیں۔ شاید اس سے لوگ متقی نہیں اس کے اثر سے ان میں تقویٰ آئے جس کے دوسرے معنی آج کل کے عرف عام میں بہترین کیرکٹر کے ہیں اور متقی سب سے اچھے اور اعلیٰ کیرکٹر رکھنے والے کو کہتے ہیں ۔

ان آیات کا ماحصل یہ ہے ۔

(۱) قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ لوگ اس کو سوچیں، سمجھیں، اور اس میں تدبر کریں،

(۲) ارباب فطانت اس کی نشانیاں دوسروں کو بھی یاد دلائیں اور خود بھی عبرت پذیر ہوں۔

(۳) اس کے ماتحت اپنے آپ میں تقویٰ پیدا کریں، خود متقی بنیں اور دوسروں کو بھی متقی بنائیں، حتیٰ کہ وہ آثار حسنہ ساری قوم پر مترتب ہو سکیں جو لازمہ تقویٰ ہیں — غور کرو — اور خوب غور کرو۔ کیا آج کل کی قرآن خوانی سے یہ اغراض حاصل ہو رہے ہیں کیا ہماری تلاوت ہم کو بھی انہیں نتائج تک پہنچاتی ہے۔ کیا ہم بھی آیات الٰہی میں تدبر و تفکر کے عادی ہیں اور اس عادت کے ذریعہ سے ہم میں کوئی تقویٰ پیدا ہوا ہے؟ حیف ہے کہ ان میں سے ایک بات بھی ہم میں نہیں، حیف ہے کہ اس نہ ہونے پر بھی قرآن کی عزت و حرمت کا ہمیں ادعا ہو۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

نمی بینیم علم و فضل در کس — نہ دریاں دلے نے درد دینے
نہ ہمت را امید سر بلند یست — نہ دعوت را کلید آ گینے
نہ حافظ را حضور درس قرآن — نہ دانش مند را علم الیقینے
خدا زاں خرقہ بیزار است صدبار — کہ صد بت باشد کشی در آستینے

درون ہا تیرہ شد باشد کہ از غیب
چراغے بر کند خلوت نشینے

۷

تعلیم رسالت میں قرآن پڑھنے کا انداز کیا رکھا تھا؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے جواب میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

کان الرجل منا اذا تعلم عشر

آیات لم یجاوزھن حتی یعرف

معانیھن والعمل بھن۔

ہم لوگوں میں سے (یعنی صحابہ میں سے) جب کوئی شخص قرآن کی دس

آیتوں کی تعلیم حاصل کر لیتا تو جب تک کہ ان کے مطالب و معانی پر اس کو دسترس نہ ہو لیتی اور ان پر عمل نہ کرنے لگتا اس وقت تک آگے نہیں بڑھتا تھا۔

دوسری روایت میں ہے۔

کانوا یستقرؤن من النبی صلے اللہ علیہ وسلم فکانوا اذا تعلموا عشر ایات لم یخلفوھا حتی یعلموا ما فیھا من العمل فتعلمنا القراٰن والعمل جمیعا

وہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پڑھتے تھے۔ جب دس آیتیں سیکھ لیتے تو جب تک ان پر عمل کرنے کی پوری تعلیم پر حاوی نہ ہو جاتے ان آیتوں کو نہ چھوڑتے لہذا ہم لوگوں نے قرآن و عمل بالقرآن دونوں کی تعلیم ایک ساتھ حاصل کی۔

حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں۔

من قرء القراٰن ثم لم یفسرہ کان کالاعمی او کالاعرابی

جس نے قرآن پڑھا اور پھر اس کی تفسیر نہ کی وہ جیسے اندھا یا گنوار ہے سوچو اور گریبان میں سر ڈال کر سوچو کر تم بھی قرآن کی تعلیم اسی طرح حاصل کرتے ہو۔ تمہارا ابھی یہی انداز تعلیم ہے اور اگر تم میں کچھ علم قرآن ہے تو کیا وہ عمل بالقرآن کے دوش بدوش ہے؟

۸

قرآن کی جو تعلیم حاصل کی جاتی تھی اور جس طرح پر حاصل کی جاتی تھی۔ اس کا اثر کیا پڑتا تھا اور اس کی خصوصیت کیا تھی؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ جس کے جواب کے لئے بھی روایات قدیمہ ہی کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔

حضرت شفیق سے روایت ہے۔

استعمل علی ابن عباس علی الحج
قال فخطب الناس خطبۃً
لو سمعھا الروم والترک
لاسلموا

حضرت علی نے عبداللہ بن عباس کو امیرالحج معتمد کیا تھا۔ ابن عباس نے حج کے موقع پر ایسا خطبہ سنایا کہ اگر اس کو رومی و ترک (جو اس زمانہ میں مسلمان نہ تھے) سنتے ہوتے تو مسلمان ہو جاتے۔

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایتیں مروی ہیں جن سب کا مفہوم یہی ہے کہ قرآن کی تفسیر اس طرز پر کی جاتی تھی کہ نا مسلموں پر بھی اس کا اثر پڑتا تھا اور ایسا اثر پڑتا تھا کہ وہ اپنا دین و مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جاتے۔ اس زمانے میں مثنوی مولوی نہ تھی۔ قوت القلوب نہ تھی۔ احیا علوم الدین نہ تھی۔ دیوان حافظ نہ تھا کہ وعظ و تذکیر سے ان کو آراستہ کیا جاتا۔ اس زمانہ میں جو کچھ بھی تھا۔ قرآن تھا۔ اور اسی کو دنیا کے روبرو اس رنگ میں پیش کیا جاتا کہ غیر قومیں اس میں جذب ہو جاتیں۔

ہفت روزہ "ستارۂ صبح"

۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء

عرب طبیعت کے فطری جوہر

بدوی سیرت پر ایک اجمالی نظر

۱۹۱۴ء میں جب حکومت کی نگاہ عتاب نے مولانا ظفر علی خاں کو نظر بند کر کے آپ کی تحریر و تقریر کی آزادی سلب کر لی۔ تو آپ نے سکاٹ کی مشہور کتاب "مورز ان سپین" کا ترجمہ شروع کیا۔ لیکن زبان و قلم پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے اور صیغہ احتساب کی سخت گیری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کے دو تین اجزاء کی طباعت بھی نہیں ہوئی تھی کہ سنسر نے اکثر اہم مسائل پر خط نسخ کھینچ دیا، اور مجبوراً مولانا موصوف کو یہ مہتم بالشان کام ناتمام ہی چھوڑ دینا پڑا۔ ذیل میں اسی کتاب کا ایک حصہ جو دستبرد روزگار سے محفوظ رہ گیا ہے۔ ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے +

اوراق سابق اس حقیقت کی پیش پا افتادگی پر گواہ ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصہ قدرت کی سخت گیری یا اپنے باشندوں کی غفلت شعاری کے باعث صدہا سال تک ایک ایسی بنجر سرزمین سمجھا جاتا رہا۔ جس میں کبھی کسی فصل کے بونے کا خیال لاحاصل تھا۔ اور جس کا پیوند سمندر اور صحرا نے زمانہ کی تہذیب و شائستگی سے جدا کر رکھا تھا۔ پھر کیا یہ اجتماع ضدین نہیں ہے کہ اسی بھائیں بھائیں کرتے ہوئے ویرانے میں ایک ایسی قوم پائی جائے جس کے ذہن رسا کی مخفی قابلیتیں بآسانی تمام ایک ایسے نظام زراعت کے قیام اور ترقی کی طرح ڈالیں، جو ہر قدیم و جدید قوم کے زراعتی کارناموں پر سبقت لے جائے۔ جو حیرت انگیز جر ثقیلی آلات کی موجد ہو۔ جو علم ہندسہ کے سب سے زیادہ دقیق اور غامض مسئلوں کو حل کرے۔ جس نے فن عمارت میں تخییل ترتیب تفصیل اور تکمیل کے لحاظ سے لطافت پاکیزگی حسن اور آرائش کی وہ شان پیدا کی ہو

جس کی نظیر روئے زمین پر نہیں ملتی۔ جس نے بڑے بڑے مستحکم شہروں کے طویل جنگی محاصرہ کے ساتھ فن حرب کی ان پیچیدہ اور ادق مشقوں میں اعلیٰ درجہ کا کمال بہم پہنچایا ہو۔ جو جنگی کامیابی کا لازمہ ہیں۔ جس نے سلطنتوں کی بنیاد رکھی ہو اور دنیا کو سبق دیا ہو۔ کہ سلطنتیں قائم کر کے برقرار کس طرح رکھی جاتی ہیں۔

ان گوناگوں کمالات میں سے کسی ایک میں بھی طاق ہونے کے لئے ایک طویل و مدید تلمذ کی ضرورت ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی کسی خلعت کو عرب سے موزونی قامت کی شکایت نہ تھی۔ عربی دماغ کی ہمہ گیر نکتہ رسی نے بغیر کسی سابقہ تجربہ یا تعلیم کے تمدن کے ان تمام شعبوں کو اس طرح اپنا کر لیا کہ گویا یہ تمام باتیں ابتدا ہی سے اس کا فطری موضوع تھیں۔ ادبیات میں بھی یہ روشنی طبع مطلع الانوار بن کر چمکتی ہے۔ اول اول ادب میں عرب صرف شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جو طبقے سب سے زیادہ روشن خیال متصور ہوتے تھے ان کا مذاق تاریخ سے ناآشنا تھا اور کوئی ایسا مواد موجود نہ تھا۔ جس پر صحیح معنوں میں لفظ تاریخ کا اطلاق ہو سکے۔ نسب کے وہ شجرے جو عربوں کے لئے مایہ ناز تھے۔ مقامی یا قبائلی شہرت رکھنے والے وحشیوں کے ناموں اور بتوں کی ایک غیر محدود اور اکتا دینے والی فہرست سے بڑھ کر حقیقت نہ رکھتے تھے۔ لیکن انہیں اکھڑ اور جاہل عربوں کی غارت گر جماعتوں نے جس ملک میں جا کر علم حکومت بلند کیا۔ ایک عظیم الشان عقلی ہلچل ڈال دی۔ ان کے کمالات انہیں تک محدود نہ تھے۔ بلکہ اغیار و اجانب کو بھی انہوں نے اپنے جیسا ہی باکمال بنا دیا۔ ان کے فیضان عام نے سرِراہ ایک سبیل لگا رکھی تھی۔ جس سے دوست دشمن یکساں سیراب ہوئے۔ اپنے ذاتی کارناموں کے علاوہ جن کی عظمت سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں انہوں نے اپنی رعایا اور اپنے باج گزاروں کی ذہنی قوتوں کو بڑھانے اور پھیلانے میں قرنہا قرن سے جہالت اور باہم پرستی اور غلامی کی جو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں ان کی ہمدردانہ کوششوں سے کٹ گئیں۔ اس ظلمت کدہ نکبت و ذلت سے نکلنے کے لئے جس شخص کی طرف سے بھی کوئی جدوجہد عمل میں آئی۔ اس کی انہوں نے دستگیری

کی تلقین و تدریس اور نمونہ و مثال سے انہوں نے ہمیشہ ایسے لوگوں کے رشک کو ابھارا اور ان کی مساعی کا حوصلہ دیا۔ خونریز میدانوں میں جو کامیابیاں ان کے حصّہ میں آئیں اور وسیع کشوروں اور سلطنتوں کی تسخیر سے جو اقتدار انہیں نصیب ہوا۔ وہ اگرچہ بہت کچھ قابل فخر ہے۔ لیکن ان کے تاج شہرت کا دل آویز ترین طرہ وہ فتح الفتوح ہے۔ جو انہیں اقلیم علم میں حاصل ہوئی۔ زمانۂ حال کے ادبیات کی لطیف ترین اصناف میں اس جوہر عقلی کا نور صاف جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ بکیشیو کے ناول، سروانٹیز کے افسانے، والٹیر کا فلسفہ، نیوٹن کی پرنسپیہ، شیکسپیر کے ناٹک، سب کو الف ابجد سے لے کر تاثے تمت تک پڑھ جاؤ، ہر ایک میں تمہیں عربی دماغ کا اعجازی نقش نظر آئے گا۔ یہ وہ نقش ہے جو زمانہ حال کے تمدن کی داستان کا طرازِ سرورق ہے۔ جس کی رنگارنگ آرائیاں نہ شرمندۂ زوال ہیں نہ رہینِ فنا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ عالمگیر نتائج کسی فوری تحریک کا ماحصل ہیں یا محض بخت و اتفاق کا کرشمہ ہیں ان کا ظہور طویل اور مدید زمانوں کے دوران میں مسلسل اور متدرج ترقیوں کے بعد ہوا ہے قدرت کے وہ نہ ٹلنے والے قانون جنہوں نے انسان کی کتاب مقدر کا شیرازہ باندھ رکھا ہے۔ اس امر کے متقاضی ہیں کہ بہت سی متقارب الجنس شکلیں ایک درمیانی حالت میں سے گذرتی ہوئی غیر محسوس طور پر بتدریج ایک دوسری میں ضم ہوتی چلی جائیں اور بالآخر افراد اور اقوام کی ذہنی و جسمانی خصوصیات میں اصولی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ فنِ تعمیر کی نشو و نما کی طرح ارتقائے نسل کی رفتار بھی بطی مگر متدرج ہوتی ہے۔ کسی عمارت کی بنیاد اور اس کی بالائی تعمیر کا باہمی تعلق ظاہر ہے۔ اگرچہ اول الذکر بادی النظر میں نگاہ سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس عرب جاہلیت کے وحشی شیوخ قبائل اور بغداد و قرطبہ کے قومی اقتدار و روشن ضمیر خلفا میں ایک بون بعید ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیا عباسی اور کیا اموی دونوں کے دونوں کا سلسلہ نسب ان بدوی قزاقوں سے جا ملتا ہے۔ جو ہر سال مکّہ کے کاروانوں کو لوٹا کرتے تھے زمانہ ماقبل تاریخ کی بھدی اور ان گھڑ تعمیر اور ایتھنز کی بے نظیر عمارات کی استادانہ صنعتی نفاست میں بظاہر کوئی وجہ مشابہت نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ انہیں بدوضع اور ناتراشیدہ پتھر کی ڈھوکوں سے جن میں فنِ تعمیر کی کوئی نزاکت یا لطافت

نہ پائی جاتی تھی۔ ان شاندار ستونوں کی ابتدا ہوئی جو عہد قدیم کے یونانی اور رومانی مندروں کا سرمایہ آرائش تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے عہد میں عربوں نے جس تیز پا رفتار سے ترقی کی اس کو مد نظر رکھ کر ہمیں مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عربوں کے بت پرست آباؤ اجداد نہ صرف اعلیٰ درجہ کی دماغی قابلیتوں سے متصف تھے جنہیں بظاہر ایک وحشیانہ زندگی کی ذلتوں اور ضلالتوں سے کوئی لگاؤ نہیں بلکہ ان میں سیاسی نظم ونسق کی طرح ڈالنے اور ان تمام فنون وصنائع سے عملی کام لینے کی حیرت انگیز استعداد موجود تھی جو بنی نوع انسان کے لئے سود مند ہیں۔ یہ استعداد عربوں کی فطرت میں صدہا نسلوں تک پرورش پانے کے بعد ایک غیر محسوس اور نامعلوم طریقہ پر صورت پذیر ہوئی اور وقتوں بحالت جمود رہ کر اپنے وقت پر نمودار ہوئی یہ ایک ایسا محیر العقول واقعہ ہے جو شوق تحقیق کے لئے اپنے جیب و داماں میں ہزاروں بوالعجبیوں کا سرمایہ رکھتا ہے اور جس کی سابق یا بعد کے زمانوں میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔

باوجود اپنی ظاہری بربریت کے عہد قدیم کی تاریخ میں عرب کچھ کم درجۂ امتیاز نہیں رکھتے۔ مصر کو انہوں نے بزور شمشیر مسخر کیا اور سلسلہ ملوک الرعاۃ کے زیر نگیں صدیوں تک اس ملک پر حکومت کی دولت رومتہ الکبریٰ کے واقعات شاہد ہیں کہ ایک عرب رومانی فوج میں بطور سپاہی کے بھرتی ہوا اور اپنے زور بازو اور حسن تدبیر سے ترقی کرتا ہوا تخت سلطنت پر جا متمکن ہوا۔ رومن فوج میں عرب سواروں کے رسالے بھی شریک تھے۔ جو نمایاں شجاعت اور جانبازی سے لڑتے تھے۔ ایک سے زائد مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا ہے کہ بدوی سپاہیوں کی زرخرید بہادری نے سلطنت ایران کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ آریلین کے ساتھ پالمیرا کی ملکہ زنوبیہ کے جو جانگسل معرکے ہوئے ان میں زنوبیہ کی عربی سپاہ ہی نے جو اس کے لشکر کا جزو غالب تھی۔ حریف کے دانت رہ رہ کر کھٹے کئے تھے۔ غرض ہر جھنڈے کے نیچے عربوں نے اپنی مسلمہ شجاعت واستقلال کا ثبوت دیا۔ لیکن ان کے ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی وفاداری اشتباہ سے بالا نہ تھی اور عرب کا نام لیسا اوقات غدار کا مترادف

سمجھا جاتا تھا۔

بدوی سیرت

عرب زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی بے چینی اور سیماب وش حرکت ہے۔ عربوں کی قومی سیرت کے نمایاں خصائص میں سے اکثر کی توجیہ ان کے اسی جبلی اقتضاء سے ہو سکتی ہے جس میں قدیم الایام سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اس جانے اور پہنچانے ہوئے تعلق میں بھی جو تجارتی سرگرمی اور متمدن عادات کے درمیان قائم ہے یہ قدرت نہ تھی کہ خانہ بدوش عرب میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے۔ تمدنی راحت و ثروت کی زبردست کشش کبھی عرب کے اس طبعی اقتضا کو دبا نہ سکی۔ جس کا میلان قزاقی و غارت گری کی جانب تھا۔ مشرقی عیش و عشرت سے مانوس ہونے کا نتیجہ اس کے حق میں فقط یہ ہوا کہ تنعم کے نازپروردوں کو وہ پہلے سے بھی زیادہ حقیر سمجھنے لگا۔ اس کا شوقِ آوارہ گردی اسے ہر جگہ لیا پھرا۔ وہ بلا خوف و خطر صحرائے لیبیا کی پر اسرار گہرائیوں میں گھسا چلا جاتا ہے۔ وہ آج افریقہ میں گھوما تھا تو کل ہندوستان میں۔ اس کی سپاہیانہ خدمات ہندوستانی افواج کی نذر تھیں۔ قیصران روم کے جیش خاص میں بھی وہ جا کر بھرتی ہوتا تھا۔ جہاں اس کا شوق حسب منفعت خاطر خواہ پورا ہو سکتا تھا اس لئے کہ دولت روما کی موت و زندگی اسی جیش کے سپاہیوں کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ جن سے گویا قیاصرہ روپیہ دے کر بعد ذلت تاج و تخت خریدتے تھے پیغمبر اسلام (صلعم) کی بعثت سے مدتوں پہلے عربوں کی بے چین زندگی کی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ رونما ہو چلا تھا۔ دشت نوردی اور قطع الطریقی کے مذاق کو ظاہر ہے کہ قلبہ رانی سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ اور بدو تو کاشتکاری کو نشان غلامی تصور کرتے تھے یہ استکراہ کہیں صدیوں میں جا کر دور ہوا۔ لیکن مقام سکونت کی تبدیلی، مدنیوں کی شائستہ و متمدن قوموں کے ساتھ ربط ضبط، ایک نئی حکمت عملی کے اختیار کرنے کی ضرورت، ایک نئے مذہب کی پند و موعظت اور راحت و ثروت کی زبردست کشش میں بھی من حیث المجموع یہ طاقت نہ تھی۔ کہ شخصی حریت اور قبائلی عصبیت کے اس خاصہ

کو نہ ٹال کر سکے جو عربی سیرت کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔ جن دنوں مشرقی اور مغربی خلافتوں کی عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ انہیں قومی خصائص نے رہ رہ کر ان سلطنتوں کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ انہوں نے عداوت کی اس تلخی کو جو حصول سلطنت کے لئے ملوک ہشتنی صمبن کی رقابت میں ملی ہوئی تھی اور زیادہ تیز کر دیا۔ انہوں نے امرا کی نزاعوں کے جھگڑے کا نے اور برقرار رکھنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اہل مذہب کے غیظ آلود پہلوئے تعصب میں ان کا نشیمن تھا۔ عوام کے جذبات و حسیات ان میں سمٹے ہوئے تھے ذاتی جھگڑوں بازاری فسادوں، مذہبی ہنگاموں اور تمام شورشوں اور خونریزیوں میں ان کا جلوہ نظر آتا تھا۔ قرون متوسط کے اسلامی تمدن کی بربادی ہر جگہ انہیں کی وجہ سے ظہور میں آئی۔ خصوصاً مسلمانوں کی اندلسی سلطنت جو اگر سب سے زیادہ جابر و مطلق العنان نہ تھی۔ تو سب سے بڑھ کر ترقی یافتہ ضرور تھی۔ عربوں کے انہیں خصائص قومی کا شکار ہوئی۔ عرب کا جلد باز اشتعال پذیر اور کینہ ور مزاج اگرچہ غیر ملکوں کی تسخیر کے لئے بہت موزوں واقع ہوا ہے۔ لیکن اس وسیع تدبر اور غیر جانبدارانہ انقیاد کی قوت کے اوصاف اس میں نہیں پائے جاتے جو حکومت کی سلامتی اور ثبات کے لئے ضروری ہیں۔

کوہستانی علاقہ کے عربوں کو شخصی آزادی کے اعلیٰ ترین حقوق حاصل تھے۔ اول تو ان کی پہاڑی کمین گاہوں کا قدرتی استحکام ہی ان کا بہت بڑا محافظ تھا۔ اس پر ان کی جفاکشی ان کی سپاہیانہ عادات اور ان کی سادہ زندگی نے ان پر غلبہ پانے کی مساعی کو بہت کچھ پر خطر کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ برابر اپنے بتوں سے لو لگائے رہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام کوششیں ان کو مطیع اسلام کرنے کے متعلق رائگاں گئیں۔ اسلام اپنے حلقہ بگوشوں کی تعداد کے لئے پر رونق شہروں کے مضافات و حوالی کا بھی زیر بار احسان نہیں ہوا۔ اسلامی عرب کی طرح بت پرست عرب میں تجارت اور مذہب کا آپس میں گہرا تعلق تھا۔ شہری آبادی کی ہمدردی پرانے مذہب کے ساتھ تھی۔ جس نے اس کی دولت اس کے مشاغل اس کے ذاتی فوائد اس کے معاشرتی، تبادلات میں حصہ لے رکھا تھا۔ تجارت اور ان کے بے شمار متوسلین نئے مذہب کو جس نے ان کے ثروت و تمول اور وقعت و

وجاہت کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اندیشہ کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کاہنوں کے طبقہ کو جو ملک کے شریف ترین خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلام سے پہلے ہی قدرتی ضد اور عداوت تھی۔ انہوں نے جہاں تک ان سے بن پڑا اسلام کی مخالفت کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں نے اسلام کی اشاعت میں بہت کم حصّہ لیا۔ دنیا کو جنہوں نے فتح کیا وہ وحشی صحرانشینوں کا ٹڈی دل تھا۔

قومیّت

حمیری کتبوں سے جن کا قفل وسواسی کلید تحقیقات جدیدہ نے حال ہی میں کھولا ہے یہ واقعہ پایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ ایک غیر معلوم زمانہ میں شمال اور جنوب سے دو قومیں اپنا وطن چھوڑ کر روانہ ہوئیں اور رستہ میں ان کا میل ہو گیا دونوں کے تعلقات بڑھنے شروع ہوئے اور یہاں تک بڑھے۔ کہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں باہمی اختلاط و ازدواج سے دونوں کی ایک قوم بن گئی۔ یہی آمیزش عربوں کی قومی اصلیت کے اشتراک کی شاہد ہے اور بعید از احتمال نہیں۔ کہ شمالی قوم وہ کنعانی آبادی تھی۔ جس کو یوشعؑ کی اولاد نے ملک بدر کیا تھا۔

نظامِ حکومت

عرب کے آوارہ گرد قبائل کی زندگی قدیم الایام میں جس طریقہ سے بسر ہوتی تھی۔ اس کے لحاظ سے ان میں نظم ونسق کے کسی باضابطہ دستور العمل یا کسی پیچیدہ مدنی نظام کا موجود ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کی سیاسی حکمت عملی بشرطیکہ ان قواعد کو جو ان کی ہئیت اجتماعی کے شیرازہ بند تھے یہ شاندار لقب دیا جا سکے اپنی نوعیت میں مشائخانہ تھی قبائل کے شیوخ یا سردار ان خاندانوں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ جنہیں شخصی قابلیت نسبی شرافت اور قدامت کے سہ گانہ اعتبارات سے فضیلت حاصل تھی۔ اور مشرق کی آبائی رسم کے بموجب شیخ قبیلہ کے کل ملازمین جو عموماً اس سے نسبت قرابت رکھتے تھے۔ کچھ دن کے بعد اس کے خانگی متوسلین کے زمرہ میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ اس طرح پر بعض قبائل کے اجزا حقیقی یا اعتباری قرابت کے تعلق یا تباہی کے

خوف سے ایک مرکز واحد پر آکر جمع ہو جاتے تھے اور انہیں اپنے ہمسایوں پر بہت بڑا تفوق حاصل ہو جاتا تھا۔ عہد اسلام سے پہلے کسی ضابطۂ قوانین اور کسی اعلیٰ سلطانہ اقتدار کا وجود نہ تھا جو کسی حاکم اولی الامر کے تفویض کیا گیا ہو یا جس پر وہ حاکم بطور خود دسترس رکھتا ہو۔ ہر خاندان خود مختار تھا۔ اور اس کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے علاوہ باقی تمام عمرانی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اپنے آپ کو مرفوع القلم سمجھتا تھا۔ حفظ نفس کے جبلی اقتضا، عام رائے کی اجتماعی قوت۔ مخالف قبائل کی دستبرد کا اندیشہ صرف یہی تین ایسی طاقتیں تھیں جو ان جماعتوں میں ایک عارضی اتحاد پیدا کر سکتی تھیں، جن کے عزیز ترین مفاد کو اندیشہ اتلاف لاحق تھا۔ شیخ قبیلہ کا اختیار برائے نام تھا۔ وہ صرف مشورہ دے سکتا تھا۔ عملاً ناظمانہ حیثیت اسے حاصل نہ تھی اس کا عہدہ بجائے مفید ہونے کے زیادہ تر آرائشی ہوتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے نہ کوئی فوجی کاروائی کر سکتا تھا۔ نہ کسی کو تعمیل حکم پر مجبور کر سکتا تھا۔ نہ نیکی کا صلہ دینے پر قادر تھا نہ برے کام کی سزا دینے پر دسترس رکھتا تھا۔ قبیلہ کے معاملات کا انتظام ان افراد قبیلہ کی ایک مجلس کے سپرد ہوتا تھا جو سن و سال وقار و وقعت اور دانش و فراست میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے۔ لیکن ان امور میں جو فلاح عامہ پر موثر تھے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ بھی ناطق نہ متصور ہوتا تھا۔ ایسے مواقع پر ہر ذی ثروت یا ذی مقدرت شخص کا مشورہ لیا جاتا تھا۔ اس سے واضح ہوگا کہ شخصی خود مختاری جو ایشیائی حکومتوں کا نمایاں ترین خاصہ ہے اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں نے انتہا کو پہنچا دیا۔ قدیم عرب میں مفقود تھی۔ اس قدیم عہد میں جمہور کی انفرادی آزادی کی باگیں یہاں تک چھوٹی ہوئی تھیں کہ بعض قبائل جمہوریت کی عام اور معمولی قیود کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کی پر آشوب ہنگامہ خیز خود سری بمشکل ان تنگ حدود تک پہنچ کر رکتی تھی جہاں سے ناموس و حمیت کی صیانت کی ابتدا ہوتی ہے۔ عربوں نے اپنے وطن میں کبھی سیاسی عظمت حاصل نہیں کی (خود مصنف کے اعتراف کے بموجب قدیم یمن اس کلیہ کی عمومیت سے مستثنیٰ ہے۔ مترجم) اس کی وجہ کچھ تو یہ قدرتی رکاوٹ ہے کہ زمین شور ہے اور پانی کمیاب، اس کے علاوہ عربوں کی پشتینی عداوتوں اور موروثی عنادوں نے افزائش تعلقات باہمی کے ذرائع کی مشکلات کے ساتھ مل کر ان کی مقامی ترقی کی راہ میں بہت سے موانع حائل کر دیئے ہیں۔ اسلام نے جو عظیم الشان انقلابات دوسری سرزمینوں میں برپا

گئے ان کے بعد بھی عربوں کے ابتدائی دستوروں اور رسموں کا برابر قائم رہنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ صحرائی آب و ہوا میں رہ کر عربوں کا قومی احیا محال ہے۔

افتادِ طبیعت

بدوی کی زندگی ہمیشہ فسادوں میں کٹتی تھی۔ جنگ اس کی مزاج ہستی کا نقطہ اعتدال تھی انتقام پسندی، شہرت پرستی اور ہمسایہ کی املاک پر تصرف کا شوق یہی وہ تین بڑی خواہشیں تھیں جن کی تکمیل اس کی زندگی کا ماٰل تھی اور صرف جنگ ہی سے ان کا پورا ہونا ممکن تھا۔ غارت گری اور سفاکی اس کی سیرت کے سب سے زیادہ نمایاں اجزا تھے۔ قزاقی کا پیشہ عرب کی نظروں میں بجائے مذموم ہونے کے معزز و محترم تھا۔ اس لئے کہ اس کا سپاہیانہ طرزِ زندگی سے قریب کا تعلق تھا جو قوم زراعت و صنعت و تجارت کے ذرائع نہ رکھتی ہو۔ وہ بعض دفعہ پیٹ پالنے کے لئے دراز دستی اختیار کر لیتی ہے صحرا میں یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا تھا۔ کہ دشمنوں کو لوٹ لیا جائے اور مسافروں سے ایک بندھی رقم جبراً وصول کی جائے کسی باقاعدہ حکومت کے موجود نہ ہونے کے باعث کسی کے پاس مال و املاک کا موجود ہونا ہر طرح سے وبالِ جان تھا۔ اور اہلِ ثروت بازیچہ قسمت بنے ہوئے تھے۔ کسی دولت مند شخص کے لئے مخالف قبیلہ کے نیزوں کی بدولت ایک ہی رات میں غنی سے مفلس ہو جانا ایک معمولی سی بات تھی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں گھات لگانے اور یک بیک حملے کرنے کے غیر محدود مواقع موجود ہوں۔ جہاں ملکیت اراضی کا کسی کو کوئی استحقاق نہ ہو۔ اور جہاں قومی دولت زیادہ تر بھیڑوں کے ریوڑوں اور اونٹوں کے گلوں پر مشتمل ہو۔ کوئی طریقہ نگہبانی کوئی ذریعہ پاسبانی ایسا نہیں۔ جو اس قسم کی آفات و مصائب کی روک تھام کر سکے۔ خطرہ کا مقابلہ کرنے اور لوٹ و تاراج کے بعد تاخت کرنے اور بغیر حریف کے تعاقب سے بچ کر نکل آنے کی جس قدر قابلیت کسی شخص میں ہوتی تھی اسی قدر وہ اپنے ہم چشموں میں ممتاز و سربرآوردہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں ظاہر ہے۔ کہ مفلسی ذلیل رسوائی ہی ہو سکتی تھی۔

روزنامہ "زمیندار"

۱۴ مارچ ۱۹۲۹ء

خسرو پرویز کے عروج و زوال کی داستان

سرورِ کائنات کے نامہ مبارک سے بے ادبی کا عبرتناک انجام

ہرمز کا بڑا بیٹا خسرو پرویز ان امرائے سلطنت کے اتفاق رائے سے تخت پر بٹھایا گیا جو بہرام چوبین کے غاصبانہ عروج کی پاسداری کرنا نمک حرامی سمجھتے تھے لیکن جب خسرو پرویز نے اس مضمون کا فرمان بہرام کے نام روانہ کیا۔ کہ بشرط اطاعت تمام ان لوگوں کو جنہوں نے علم بغاوت بلند کیا ہے عام معافی دی جائے گی اور خود بہرام کا مرتبہ سلطنت میں شہنشاہ سے صرف دوسرے درجے پر سمجھا جائے گا تو بہرام کی بڑھتی ہوئی قوت نے اس فیاضانہ تجویز کو سرِ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اور ساس کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا کہ پرویز کو زیادہ سے زیادہ ایک ولایت کی صوبہ داری دی جا سکتی ہے۔

نوشیرواں کے پوتے کے لئے اب بہرام پر فوج کشی کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا لیکن فوج کہاں سے آتی۔ ملک کی ساری جنگی قوت تو بہرام کی نئی دولت کا دم بھرنے لگی تھی مجبوراً پایہ تخت کی آبادی اور قصرِ شاہی کے غلاموں کی ایک اٹکل بے جوڑ اور بیگانہ ناآشنا جمعیت فراہم کر کے اس نے حریف کا رخ کیا۔ لیکن ایک ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہرام کے لئے اب میدان بالکل صاف تھا۔ اس کی شاہانہ امنگوں کے رستے میں اگر کوئی رکاوٹ نادانستہ طور پر باقی رہ گئی تھی تو وہ خسرو پرویز کی ذات تھی جو تماشائے تقدیر کا ایک اور ہفت رنگ پردہ اٹھانے کے لئے مداین سے جان سلامت لے کر فرار ہو گیا۔

خسرو پرویز اور قیصر مارس

خسرو جب اپنے اہل و عیال اور چند جاں نثار رفیقوں کے ساتھ صرف تیس سپاہیوں

کی حفاظت میں اپنے آباؤ اجداد کے پایہ تخت سے بحسرت رخصت ہوا تو اس کے لئے فرار کے تین راستے کھلے تھے وہ یا تو قفقاز کی دشوار گزار کوہستانی وادیوں میں جاکر سر چھپا سکتا تھا یا ترکوں کی امان طلب کر سکتا تھا۔ جو اپنی پچھلی شکست کی رسوائی کا داغ بہرام کے خون سے دھونے کے لئے بیتاب تھے اور یا قیصر روم کے ظل حمایت کو اپنی بے کسی کا پردہ دار بنا سکتا تھا۔ پہلی دو تجویزیں بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد رد کر دی گئیں۔ تیسری تجویز کے اختیار کرنے میں صرف خسرو کے خود دارانہ جذبات سنگ راہ تھے۔ صدہا سال کی ساسانی و بازنطینی رقابت اسے اجازت نہ دیتی تھی کہ جس سلطنت کو اس کے آباؤ اجداد کی قوت بازو بارہا نیچا دکھا چکی تھی اس کو اپنا ملجا و ماوا بنا کر بزرگوں کے نام کو بٹہ لگائے لیکن مصائب کا سیلاب آتا ہے تو اس قسم کے آبا پرستانہ جذبات خس و خاشاک ہو کر ان میں بہ جاتے ہیں۔ آخر فیصلہ کن رائے یہی قرار پائی۔ کہ شاہ پہنچ کر تاجدار قسطنطنیہ سے امداد طلب کرنی چاہئیے۔

یہ پریشان روزگار شاہی قافلہ رات کے وقت مدائن سے اس خاموشی کے ساتھ رخصت ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ دریائے فرات کے کنارے کنارے بادیہ عراق کو منزل بمنزل قطع کرتے ہوئے آخر خسرو اور اس کے ساتھی سرشیم کے رومی قلعہ سے دس میل کے فاصلہ پر خیمہ زن ہوئے قلعہ دار کو جب خسرو کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ پیشوائی کے لئے آیا اور پورے ادب و احترام کے ساتھ غریب الوطن تاجدار کو قلعہ میں لے گیا۔ سرشیم سے قیصر مارس کے مہمان کی حیثیت میں خسرو خدم و حشم کے ساتھ ہیراپولس پہنچا جہاں بازنطینی حکومت کی طرف سے اس کی مدارات اور بزرگداشت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔

ہیراپولس سے خسرو نے اپنے قاصد کو ایک دستی خط قیصر مارس کے نام دے کر قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس خط میں گردش روزگار کا شکوہ کرتے ہوئے جو بال ہما کو مگس رانی بخشش دیتی ہے خسرو نے اول تو بہرام چوبیں کی محسن کشی اور حق ناشناسی کے تذکرے سے اس کی غاصبانہ سرکشی کو شہنشاہیت کے آسمانی حق میں ایک ہرمنی تصرف کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ پھر یہ بتا کر کہ روم و ایران جن سے ربع مسکوں کی قوت کا توازن قائم ہے بازنطینی اور ساسانی تاجداروں کے سایہ عاطفت ہی میں کائنات کی رونق و زینت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مارس سے امداد کی التجا کی تھی

جس سے بجائے خود رومی مفاد کے تحفظ کا پہلو نکلتا تھا۔ آخر میں یہ امید ظاہر کی گئی تھی۔ کہ قیصرِ روم نویسندۂ مکتوب کو قسطنطینیہ بھیج کر بالمشافہ عرضِ مدعا کے ساتھ اس یقین کے اظہار کا موقع دے گا۔ کہ بازنطینی حکومت کی طرف سے جو امداد اس نازک ساعت میں ایک مصیبت زدہ ہمسایہ کو ملے گی وہ دونوں دولتوں کے رشتۂ الفت و مودت میں ایک مضبوط گرہ لگا دے گی۔

خط کے جواب میں مارس نے خسرو کے سفر قسطنطنیہ کی خواہش کو اس اخلاق آمیز حیلہ سے ٹال دیا کہ اس کے معزز مہمان کو اتنے بڑے طویل سفر سے مفت کی صعوبتوں کا سامنا ہو گا۔ البتہ امداد دینے کے لئے پوری آمادگی ظاہر کی یا ایک مسل بجواہر تاج جس سے خسرو کے دعاوی کی تصدیق مقصود تھی اور جواہرات اور اشرفیوں کا ایک بڑا انبار نوخیز وارث کے پوتے کی نذر کیا گیا۔ ایک زبردست رومی فوج شام اور آرمینیا کی سرحدات پر فراہم کی گئی۔ اور فوج کے کمانڈر کو ایما کیا گیا۔ کہ دجلہ کے پار جاکر خسرو پرویز کو اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر بٹھائے بغیر دم نہ لے۔

خسرو جب اس فوج کے ساتھ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی حدود میں داخل ہوا تو ایران میں ایک نئی تبدیلی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ جنہوں نے اس کی مہم کو بہت کچھ آسان کر دیا۔ اہل ایران فطرتاً شاہ پرست واقع ہوئے تھے۔ بادشاہ ان کے نزدیک سایہ یزداں تھا اور اس کے اقتدارات سماوی الاصل تھے جن میں شاہی خاندان کے سوا اور کوئی شخص خواہ وہ کیسا ہی عالی نژاد کیوں نہ ہو تصرف کرنے کا مذہباً مجاز نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساسان کے چشم و چراغ کو ایک باغی صوبہ دار کی ہوس جہانبانی پر قربان کرنے کے بعد وہ پشیمان ہونے لگے تھے۔ بہرام نے جب نشۂ طاقت سے سرشار ہو کر تاج ایران اپنے سر پر رکھنا چاہا تو علمائے مجوس نے اس مذہبی رسم کی بجا آوری سے دلیرانہ انکار کر دیا۔ جب اس انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے تاج پوشی کی رسم بزورِ شمشیر انجام دے لی تو محل میں سازشوں کا جال بچھ گیا شہر میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور صوبوں میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان فسادوں کو بہرام نے جنگی قوت سے دبانا چاہا اور بہت سے مفسدہ پرداز بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیئے گئے۔ لیکن ان جابرانہ تدابیر نے رعایا و امرا کی بے چینی کو اور بڑھا دیا۔ اور جب خسرو اپنے رومی حلیفوں کے ساتھ ساسانی جھنڈا اڑاتا ہوا دجلہ کے کنارے پہنچا تو سارا ملک بہرام سے ٹوٹ کر اس سے آملنے کے لئے

تیار تھا۔ امرائے سلطنت اور رعایا کے گروہ اپنے بچھڑے ہوئے بادشاہ کا استقبال کرنے کے لئے چاروں طرف سے آنے لگے۔ اور خسرو کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔

بہرام چوبین کی ہزیمت

بہرام نے بہت چاہا۔ کہ کسی طرح رومی فوج کے شاہی اور ارمنی جناح آپس میں متحد نہ ہونے پائیں۔ لیکن وہ اس اتحاد کو روک نہ سکا۔ بہرام کی فوجی جمعیت چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس کے مقابلہ میں متحدہ رومی اور وفادار ایرانی افواج کی تعداد ساٹھ ہزار تھی عراق عجم کی سرحد پر حریفوں میں گھمسان کا رن پڑا اور دونوں نے دل کھول کر داد شجاعت دی لیکن تقدیر نے جس مقصد کے لئے بہرام چوبین کو اقبال کی عارضی مسند پر بٹھایا تھا۔ وہ پورا ہو چکا تھا خسرو اپنے حلیفوں کی تائید سے غالب آیا اور بہرام کو شکست کھا کر میدان جنگ سے ترکستان کی طرف فرار ہونا پڑا۔ اس خانہ بدوشی کے عالم میں ایک دن اس کا گزر ایک بڑھیا کی جھونپڑی میں ہوا۔ اور دونوں میں جو باتیں ہوئیں ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عوام کے نزدیک شاہی نسل کے سوا کسی دوسرے شخص کا مدعی حکومت ہونا گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ اس مکالمہ کا اقتباس جس سے ایران قدیم کے شاہ پرستانہ مذہبی جذبہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مقام پر خالی از لطف نہ ہوگا۔

مردان سینا اور یزدان گشنا سپ دو جان نثار رفیقوں کے ساتھ بہرام میدان جنگ سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ او جب تک تعاقب کا خطرہ فرسنگ ہا فرسنگ پیچھے نہ رہ گیا رستے میں کہیں نہ رکا۔ ایک دن راکب و مرکب تھک کر چور چور ہو رہے تھے۔ کہ ایک گاؤں نظر آیا۔ جس میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ بہرام اور اس کے دونوں ساتھی ستانے کے لئے یہیں اتر پڑے اور بڑھیا کی جھونپڑی میں داخل ہو کر توشدان سے ناشتہ نکالا۔ ناشتے سے فارغ ہو چکے تو شراب کی باری آئی۔ لیکن پاس کوئی پیالہ نہ تھا۔ بڑھیا سے جب پیالہ مانگا گیا تو کدو لے آئی۔ بہرام نے اسی کا پیالہ بنا لیا جو اس کی تقدیر سے مدت دیر تک گردش میں آتا رہا۔ توشدان میں کچھ میوہ بھی تھا۔ شراب کے بعد جب تنقل کا وقت آیا۔ تو بڑھیا سے میوہ رکھنے کے لئے کوئی طشتری مانگی گئی۔ پیالہ کی بجائے وہ کدو لائی تھی۔ طشتری کی جگہ چھاج لیتی آئی اور

بہرام کو حبس کے دستر خوان پر کل تک سونے چاندی کے باسن چنے ہوئے نظر آتے تھے۔ آج تفکر کے لئے اسی انوکھے ظرف پر قناعت کرنی پڑی۔ بچا ہوا کھانا اور میوہ و شراب بڑھیا کو دے کر بہرام نے پوچھا کہ بڑی بی کہو کیا خبریں ہیں؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ آج گھر گھر یہی چرچا ہو رہا ہے کہ کسریٰ نے رومی فوجوں کی مدد سے بہرام کو شکست دے کر اپنا کھویا ہوا ملک اس سے واپس لے لیا ہے۔ بہرام نے کہا کہ یہ تو ہم نے بھی سنا ہے۔ لیکن اس بہرام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔ بڑھیا چھوٹتے ہی بولی کہ اس سے بڑھ کر احمق اور کون ہو سکتا ہے کہ شاہی خاندان میں سے نہیں۔ لیکن سلطنت کا دعویٰ کرتا ہے۔ بہرام یہ سن کر ہنسا اور کہنے لگا کہ سچ کہتی ہو۔ اگر احمق نہ ہوتا تو کدو میں ڈال کر شراب نہ پیتا اور چھاج میں رکھ کر میوہ نہ کھاتا۔

خسرو پرویز اب اپنے آبا و اجداد کی پرشکوہ مسند پر بصد کر و فر متمکن ہوا۔ شیرازہ سلطنت جسے بہرام چوبین کے خروج نے کچھ عرصے کے لئے بکھیر دیا تھا۔ اس کے حسن تدبیر سے از سر نو بندھ گیا اور ساسانی قوت تھوڑے ہی عرصہ میں بحال ہو گئی۔ مارس نے جو احسان خسرو پر کیا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ آسانی سے بھلایا جا سکے۔ خسرو مارس کو از راہ عنایت و منت و احترام باپ کہہ کر پکارتا تھا اور اس تعظیمی جذبہ میں مارس کی اس احسان فروشی سے بھی کوئی کمی نہ آنے پائی تھی کہ فوجی امداد کے معاوضہ میں اس نے خسرو سے مرطرو پولس اور دارا کے سنگین سرحدی قلعوں کے علاوہ ولایت آرمینیا بھی حاصل کر لی تھی جس کے اضافہ سے دولت مشرقیہ کی حدود ارس اور سواحل بحیرہ خزر تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مارس کے مرتے دم تک روم و ایران کے یہ مخلصانہ تعلقات مضبوطی سے قائم رہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان ہمسایہ سلطنتوں کا رشتہ اب مدت ہائے مدید تک ٹوٹنے نہ پائے گا۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

خسرو پرویز کا عروج

جن اہم واقعات پر ہم اب قلم اٹھاتے ہیں ان کی ترتیب اسی صورت میں اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتی ہے کہ خسرو پرویز کے لبست و ہشت سالہ عہد حکومت کو ذیل کے

چار ادوار میں تقسیم کر دیا جائے

(۱) دور اول (۵۹۰ء تا ۶۰۲ء) جو بہرام چوبین کی شکست اور خسرو پرویز کے اقتدار کی بحالی سے شروع ہو کر مارس کے قتل اور فوکاس کی تخت نشینی پر منتہی ہوتا ہے۔ اس بارہ سال کی مدت میں ایران کی اندرونی قوت مارس اور خسرو پرویز کے مخلصانہ تعلقات کی بدولت منتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

(۲) دور ثانی (۶۰۲ء تا ۶۱۶ء) خسرو مارس کے قتل کا انتقام لینے کے لئے اعلان جنگ کرتا ہے اور چند شاندار معرکوں کے دوران میں دولت مشرقیہ کو زیر و زبر کر دیتا ہے اور اگرچہ اس عرصہ میں فوکاس ہرقل کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے جس سے خسرو کو کوئی وجہ پرکاش نہیں۔ لیکن باوجود ہرقل کی منت سماجت کے جنگ ختم نہیں ہونے پاتی تاآنکہ ۶۱۶ء یعنی سورۂ روم کا زمانہ تنزیل ہے۔ ساسانی فوجیں ایک طرف تو نیل کو عبور کرتی ہوئی طرابلس پر قابض ہو جاتی ہیں۔ اور دوسری طرف باسفورس کے کنارے ڈیرے ڈال کر خود قسطنطنیہ کا دروازہ جا کھٹکھٹاتی ہیں۔

(۳) دور ثالث (۶۱۶ء تا ۶۲۲ء) ممالک مفتوحہ پر خسرو کو شہنشاہانہ گرفت اور ہرقل کی انتہائی رسوائی کے لحاظ سے جس نے غلامانہ باجگزاری کی ذلیل ترین شکل اختیار کی۔ یہ چھ سال کا دور گویا دور ثانی ہی کا تتمہ ہے۔

(۴) دور رابع (۶۲۳ء تا ۶۲۸ء) دفعتہً خدائے بزرگ و برتر کی قدرت کاملہ ظاہر ہوتی ہے۔ جو بات انہونی نظر آتی تھی۔ ہو کر رہتی ہے نوامیس فطرت تک بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دولت مشرقیہ کے شجر حیات میں جو ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ سبز کونپلیں نکل آتی ہیں قرآن کریم کے اٹل وعدے کے مطابق ۶۲۳ء میں ہرقل ناتواں اور بے سرو سامان ہونے کے باوجود خسرو کو شکست دیتا ہے اور ان شکستوں کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ تاآنکہ وہ ناقابل عفو گستاخی جو خسرو نے اسلام سے کی تھی اس کی حیات مستعار کا رشتہ دردناک عذاب کے ساتھ منقطع کر دیتی ہے۔

دور اول کو جس کی تفصیل ہمارے مقاصد سے خارج ہے۔ قلم انداز کر کے ہم اس

فصل میں دوسرے دور کے وقائع پر نظر ڈالتے ہیں۔

مدائن و قسطنطنیہ کے باہمی تعلقات اس قدیم رسم کی بجاآوری کے مقتضی تھے۔ کہ ہر نیا تاجدار اپنی تخت نشینی کی اطلاع ایک سفارت کے ذریعہ سے ہمسایہ سلطنت کو دیا کرے۔ فوکاس نے اپنی تخت نشینی پر سفارت کا منصب للیاس کو تفویض کیا۔ جس نے مارس اور اس کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر فوکاس کے قدموں پر ڈال کر نئے قیصر کے دربار میں خاص رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ للیاس نے مدائن پہنچ کر جب اپنے آقا کا ہدیہ سلام کج کلاہ عجم کو پیش کیا۔ اور اس خونچکاں انقلاب کی کیفیت بیان کرنی شروع کی۔ جو قسطنطنیہ میں واقع ہوا تھا۔ تو خسرو نے برہم ہو کر منہ پھیر لیا۔ مارس کے احسانات کی یاد اس کے دل میں تازہ ہو گئی۔ محسن کی سربریدہ لاش کا مطالبۂ انتقام اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ فوکاس کے حق مسند نشینی کے جواز سے انکار کرتے ہوئے اس نے سر دربار اعلان کر دیا۔ کہ اس قسی القلب غاصب سے اپنے منہ بولے باپ کا بدلہ لے کر رہے گا۔ للیاس اپنی قاتلانہ خدمات کی پاداش میں قید کر دیا گیا۔ اور معاہدہ روم و ایران کے پرزے ہوا میں اڑا کر طبل جنگ بجا دیا گیا۔

ہوس جلب منفعت اور خواہش توسیع سلطنت کے گونہ مطالبات بھی اس موقع پر ان منتقمانہ جذبات کے ممدومعاون ہو گئے۔ جن کے قاہرانہ مظاہرہ پر مروت اور انسانیت کو اصرار تھا۔ اعیان دولت اور پیشوایان مذہب کی اداشناس بے باکی نے جو لاگر مذاہ ستاکش کی بہترین قائم مقام ہے۔ خسرو پرویز کو رومیوں جیسی نابکار قوم کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھنے پر ملامت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان نشاہ کش موذیوں کے وجود سے صفحۂ ہستی کو پاک کر دیا جائے اور خسرو نے اس خوش آیند سرزنش کے آگے بڑی خوشی سے سر تسلیم کر دیا۔

مارس کے زمانہ میں مشرقی افواج کی کمان ایک عجمی امیر نارسوبہ کے ہاتھ میں تھی جو بازنطینی سرکار کی اعلیٰ ملازمت میں منسلک ہو کر اپنی وفادارانہ خدمت اور نمایاں قابلیت کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا تھا۔ بہرام چوبین کے مقابلہ پر خسرو پرویز کے ہمراہ مارس نے جو فوج بھیجی تھی۔ اس کا سرلشکر یہی نارسوبہ تھا۔ اس وقت بھی سپہ سالاری مشرق اسی نامور امیر سے متعلق تھی۔ خسرو کی طرف سے جب جنگ کا اعلان ہوا تو فوکاس نے اس خیال سے کہیں

نارسوبر کی وفاداری کا آبگینہ قومی پاس داری کے پتھر کی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ نہ جائے۔ اس کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ اپنی مدت العمر کی جان فروشانہ خدمات کا یہ انوکھا صلہ پا کر نارسوبر کے پائے وفا میں بھی لغزش آ گئی۔ ہیراپولس پہنچ کر اس نے علم تمرد بلند کر دیا اور فوکاس کو گھر کے اس بھیدی کی خطرناک شورش سے لینے کے دینے پڑ گئے۔ آخر اس کے عیارانہ مصلحت آمیز فرمان کے اجرا نے جو نوازش ہائے گوناگوں کی جھوٹی تسلیوں پر مشتمل تھا، نارسوبر کی بغاوت کو اطاعت میں تبدیل کر دیا۔ کچھ دن بعد نارسوبر کی سادہ لوحی قضا مبرم بن کر فوکاس کے ایک جدید بلاطفت آمیز فرمان کے امتثال میں اسے قسطنطینیہ لے گئی۔ جہاں شارع عام پر وہ ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں زندہ جلا دیا گیا۔

نارسوبر کی موت نے خسرو کی پیش قدمی کا رستہ صاف کر دیا۔ اسی فوج نے جو نارسوبر کی قیادت میں بارہا فاتحانہ شجاعت کے جوہر دکھا چکی تھی اب اپنے کار آزمودہ سپہ سالار کی رہنمائی سے محروم ہو کر دو مرتبہ اس بری طرح شکست کھائی کہ جو دستے ایرانی شہسواروں کی جھپٹ میں آنے سے بچ رہے تھے ان کے اکثر حصے ایرانی فوج کے ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچلے یا ایرانی قادر اندازوں کے تیروں سے چھد گئے اور ہزارہا اسیرانِ جنگ کی گردن میدان کارزار ہی میں خسرو کے حکم سے اس خطا پر اڑا دی گئی کہ یہ سب کے سب ماریس کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔

فوکاس کا عہد شئوم پے در پے شکستوں تیز تر تزلزلوں کا ایک نامتناہی سلسلہ ہے۔ جس کا ہر حلقہ خسرو پرویز کی تیغ جہاں کشا کی بے تابیوں کا گواہ ہے۔ ماردین، دارا، امید (دیار بکر) اور اولیا دعرفیا کے مستحکم سرحدی شہروں کو یکے بعد دیگرے مسخر کر کے خسرو نے ان کی قلعہ بندیاں زمین کے برابر کر دیں۔ اس تمام علاقہ کی تسخیر کے بعد فرات کے پار اتر کر اس نے شام کا رخ کیا ہیراپولس، حالسس اور حلب پر قابض ہو جانا اس کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے لئے صرف چند دن کی بات تھی۔ ادھر سے فارغ ہو کر وہ انطاکیہ کے محاصرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس دولت مند مستحکم شہر کو بھی آخر اپنا پرغرور سر اس کے قدموں پر رکھ کر امان طلب کرنی پڑی۔

فوکاس اس وقت قتل ہو چکا تھا۔ اور دولت مغربیہ کی کانٹوں بھری سیج پہلے سے ہرقل

کے ترکہ میں آئی تھی۔ قسطنطین کی مسند پر بیٹھنے کے بعد ہرقل کو میدان جنگ سے جو پہلی اطلاع موصول ہوئی وہ سقوط انطاکیہ کی وحشت اثر خبر تھی اور اسی قسم کی منحوس خبروں کا سلسلہ ابھی کامل بارہ برس تک جاری رہنے والا تھا۔ قیصریہ کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے عراق اور شام کے دوسرے شہروں کا ہوا تھا۔ قلعہ بند مقامات جب ایک ایک کر کے سر ہو گئے تو اندرون ملک کی بے پناہ آبادیاں خود بخود کسریٰ کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔ کچھ دن غوطہ دمشق کی دلفریب نزہتگاہ میں ستا کر خسرو فنیقیہ کے ساحلی شہروں کو حوالہ تیغ و آتش کرتا ہوا بیت المقدس کی طرف بڑھا جس کی آرزوئے تسخیر کا ترکہ نوشیرواں اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مجوسیت کے متعصبانہ بغض کو بھی مسیحیت کی اس مقدس یادگار کے مٹانے پر اصرار تھا۔ مجوسیوں کے علاوہ یہودیوں کی ازلی شقاوت بھی اس برگزیدہ انسان کی یاد سے انتقام لینے کے لئے بے تاب تھی جس کی تذلیل و تعذیب سے انہوں نے اس کی زندگی ہی میں سبھی جتن کئے تھے۔ چنانچہ مدفن مسیح کے انہدام کی ناپاک خدمت انجام دینے کے لئے باسٹھ ہزار یہودی رضاکارانہ حیثیت سے خسرو کی فوج میں بھرتی ہو گئے یا دیہ نشینان عرب بھی جن کے لئے مال غنیمت خوان حیات کا حکم رکھتا ہے قتل و غارت کی توقعات کی بو پا کر ہزاروں کی تعداد میں تاجدار ایران کے جھنڈے تلے آ جمع ہوئے۔ اس ٹھاٹھ کے ساتھ سیل عجم کی یہ موج گوناگوں فلسطین کی سیاسی و مذہبی عظمت کو بہائے جانے کے لئے آگے بڑھی۔

فلسطین کی قیصری افواج کا دریائے یرموک پر خسرو سے مقابلہ ہوا لیکن چڑھی ہوئی ندی کو چند تنکے کس طرح روک سکتے ہیں۔ سیل ایران کا ایک ہی ریلا ان کو خس و خاشاک کی طرح بہائے گیا۔ اس تمہیدی فتح نے بیت المقدس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ایک زبردست حملہ کے بعد خسرو کی فوجیں پایۂ تخت فلسطین میں داخل ہو گئیں اور داخلہ کی رسم ان تمام وحشیانہ ظلم آرائیوں کی نمائش سے منائی گئی جن کا اہتمام خسرو کی فاتحانہ نخوت، مجوسیت کے قلبی بغض، یہودیوں کی پشتینی عداوت اور اعراب بادیہ کے غارتگرانہ قتل و نہب کی متفقہ طاقتوں نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ مرقد مسیح، کلیسائے ملکہ ہیلینا، کلیسائے قسطنطین اعظم میں آگ لگا دی گئی مسیحی زائرین کی سہ صد سالہ عقیدت نے زر و جواہر کے جو گرانمایہ چڑھاوے ان مقدس معابد و

صوامع میں چڑھا دئے تھے۔ چند گھنٹوں میں لوٹ لئے گئے۔ وہ صلیب جس پر از روئے روایت جناب مسیح کے جسد اطہر کو مصلوب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اٹھا کر مدائن بھیج دی گئی۔ باشندگان شہر کے قتل عام کا حکم دیا گیا۔ جن کے خون سے بیت المقدس کے گلی کوچوں میں سیلاب آگیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس موقع پر نوّے ہزار سے کم عیسائی تہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے کئی ہزار عیسائیوں نے جو طعمہ تیغ و سنان ہونے سے بچ رہے تھے۔ بھاگ کر اسکندریہ میں پناہ لی جہاں صدر اسقف یوحنا کی خیرات و مبرات ان گرفتاران بلا کے لئے چند روزہ وجہ کفاف بنی رہی۔

لیکن وہی بجلی جو بیت المقدس پر گری تھی۔ اسکندریہ کو بھی تاک رہی تھی۔ فلسطین کی خاک اڑا کر خسرو پرویز ارض فراعنہ میں داخل ہوا اور اہرام مصر سے لے کر حبش کی سرحد تک تمام وادی نیل کو کیہ مجم سے روندی گئی۔ ممفس سے (جہاں اب قاہرہ واقع ہے) خسرو اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ ممکن تھا کہ دولت مشرقیہ کا جنگی بیڑا سمندر کی طرف سے مزاحم ہو کر اس پر رونق شہر کو بھی فاتح کی دستبرد سے بچانے کی کوشش کرتا لیکن خسرو کے فاتحانہ کارناموں کی ایسی دھاک بندھی ہوئی تھی کہ رومیوں کو مدافعت کا خیال تک نہ پیدا ہوا۔ اسقف یوحنا اور حاکم اسکندریہ بدحواسی کے عالم میں جہاز پر سوار ہو کر جزیرہ قبرص کی طرف فرار ہو گئے اور بازنطینی اقتدار کے اس مصری مرکز کو جو باعتبار آبادی و تمول قسطنطنیہ سے صرف دوسرے درجے پر تھا۔ ایرانی فوجوں کی لوٹ کے لئے چھوڑ گئے۔

فتح مصر سے فارغ ہو کر خسرو کی جہاں کشا عزیمت نے مغربی افریقہ کا رخ کیا۔ برقہ کی رومی نوآبادیاں جلا کر خاک سیاہ کر دی گئیں۔ بازنطینی اقتدار کے تمام آثار ملیامیٹ کر دئے گئے اور طرابلس سے جو ساسانیوں کی فاتحانہ پیش قدمی کا منتہا ہے۔ خسرو نے اپنے پایہ تخت کی طرف مراجعت کی۔

فلسطین و مصر کی مہم پر روانہ ہوتے وقت خسرو نے ایک کار آزمودہ کماندار کی قیادت میں ایک فوج جرار ایشیائے کوچک کے شمالی علاقوں کی تسخیر کے لئے روانہ کی تھی۔ اس فوج کے پھریروں کو بھی علم پرویزی کی طرح فتح و نصرت بوسہ دیتی رہی فرات کے کنارے سے اس کی فاتحانہ تاخت باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئی۔ چالسیڈن ایک طویل محاصرہ کے بعد سر ہو گیا۔ اور

ایرانی فوج نے قسطنطنیہ کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ جس کی موجودگی بازنطینی پایہ تخت کو دس سال تک انقیاد و انہدام کی دھمکی دیتی رہی بحیرہ مارمورا کا تمام ساحل اسی فوج کی شبانہ روزہ سرگرمیوں سے ایرانیوں کے حیطۂ اقتدار میں آگیا۔ اندرون ملک میں انگورہ پر بھی حکومت قائم ہو گئی مغربی ایشیا کے ساحلی علاقے پر چھا جانے کے ساتھ جزیرہ روڈس پر بھی خسرو کے فوجی عمال مسلط ہو گئے۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر بری طاقت کے ساتھ خسرو کے پاس بحری طاقت بھی اسی نسبت سے ہوتی۔ تو یورپ بھی اس کی حلقہ بگوشی سے بچ نہ سکتا۔

ایران قدیم کی عظمت کا جو آفتاب اردشیر بابکان کی تخت نشینی پر طلوع ہوا تھا۔ وہ اب بعید المعانی و درخشانی نقطۂ نصف النہار پر چمکتا ہوا نظر آیا۔ بابک نے سوا چار سو سال ہوئے جو خواب دیکھا تھا وہ حرف بحرف پورا ہو گیا۔ ساسانیوں کی سلطنت خراسان سے کر طرابلس اور وہاں سے کر باسفورس تک پھیل گئی۔ اور مداین کا دربانہ نقارہ انا لاغیری بجاتا ہوا سنا گیا۔

مصر، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک میں جہاں اقتدار حکومت نے آتش پرستانہ ثنویت کا پلہ مسیحیت کے مقابلہ میں گراں کر دیا تھا۔ اب ہر جگہ آگ بھڑکتے دیکھ کر لاطینی عقیدہ رکھنے والے عیسائیوں کے جگر پر چھریاں چل گئیں۔ نسطوری فرقہ کے خارج از کلیسا مسیحیوں اور ستم رسیدہ یہودیوں نے جن کی متفقہ بددلی دولت مشرقیہ کی متواتر ہزیمتوں کا بہت بڑا عنصر ثابت ہوئی تھی۔ خسرو پرویز کی سرکار سے مورد الطاف فراواں ہو کر اپنی مجوس دوستی سے کلیسیائے عیسوی کے اساقف و بطارقہ کی دینی غیرت کو ایک اور چرکا لگایا۔ خسرو خوب جانتا تھا کہ کیتھولک مسیحیوں کا یہ بغض و عناد موقع پا کر ایک فتنۂ عظیم کی شکل پکڑ سکتا ہے۔ اسی لئے مفتوحہ ممالک میں اس کی حکومت کا انداز سخت جابرانہ تھا اور اپنی نئی رعایا کی قوت کو توڑنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ متمول اور خوش حال افراد رعایا سے بڑے بڑے تاوان اور سنگین جرمانے وصول کر کے اور مشرقی گرجاؤں کو توڑ پھوڑ کر ان کی تمام دولت لوٹ کر اس نے اپنی دانست میں مسیحیت کی طاقت کو گویا ہمیشہ کے لئے سلب کر دیا۔ اپنے مقبوضات جدیدہ میں اسے جس قدر سونا، چاندی، جواہرات، سنگ مرمر کے ستون، فنون لطیفہ کے بوقلموں نوادر

ہاتھ آئے سب کے سب اپنے پایۂ تخت کو منتقل کر دیئے۔

مدائن اگرچہ سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ لیکن خسرو نے اپنی سکونت کے لئے پایہ تخت سے ساٹھ میل بجانب شمال ایک عالی شان محل تعمیر کیا تھا۔ جو قصر دستاگرد کے نام سے مشہور ہے۔ شاہی پایگاہ ہونے کے باعث دستاگرد اور اس کے مضافات و حوالی نے بڑھتے بڑھتے ایک عظیم الشان شہر کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ دنیائے تمدن کے نفائس و غرائب کا خلاصہ ہونے کی حیثیت سے دستاگرد کے عجائبات کی جو دل غریب تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔ اسے دیکھ کر جنت الفردوس کی تصویر کا دھوکا ہوتا ہے۔ اطراف قصر میں دور تک لہلہاتے ہوئے مرغزار چلے گئے تھے۔ جن میں چکور، مور، شتر مرغ اور ہرن چرتے چگتے نظر آتے تھے۔ نو سو ساٹھ فیلان کوہ پیکر بیس ہزار اشتران سبک گام اور چھ ہزار اسپان صبا رفتار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خسرو پرویز کی سواری نکلتی ہوگی۔ یا وہ کسی مہم پر جاتا ہوگا تو اس کے خدم و حشم اور طنطنہ و تجمل کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ قصر شاہی کے دروازے پر رات دن چھ ہزار زرہ پوش کمر بستہ سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا اور قصر کے اندر جس کے زمین دوز حجرے نقد و زر، لعل و گوہر، و بیش قیمتی و دیبا اور مشک و عنبر کے ذخائر سے پٹے پڑے تھے۔ مختلف خدمات کی بجا آوری کے لئے بارہ ہزار غلام اور کنیزیں مامور تھیں۔ قصر کی آسمان بوس چھت جس میں ایک ہزار طلائی کرے بروج آسمان کی حرکت اور سیاروں کی گردش مہندسانہ کا سماں دکھانے کے لئے آویزاں تھے۔ چالیس ہزار روپہلے ستونوں کے سہارے کھڑی تھی اس دربار عشرت کدہ کی بہار شیریں کی کافرماجرائی سے دوبالا ہوتی جاتی تھی۔ اگرچہ اس کے انداز تغافل کی تلافی کے لئے تاجدار عجم نے تین ہزار اچھوتی نازنینوں کو بھی جمع کر رکھا تھا۔ جنہیں بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب دفتر حسن کا انتخاب کہنا چاہیئے۔ شاید اسی حقیقت کا انکشاف ہمارے شاعر کی فلسفیانہ نکتہ سنجی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست

آں تیشۂ فرہادے ایں حیلۂ پرویزے

خسرو پرویز کا انجام

فانتقمنا منھم فانظر کیف کان عاقبۃ المکذبین

جنگ احزاب میں جب وہ تمام منصوبے جو کفر اسلام کی بیخ کنی کے لئے باندھ کر آیا تھا خاک میں مل چکے اور حدیبیہ کی "فتح مبین" نے سازگار حالات پیدا کر دیئے تو وقت آگیا کہ تاجدار کونین سلاطین عالم کو پیام توحید پہنچا کر اس فرض عظیم سے سبکدوش ہوں جس کی بجا آوری کے لئے رحمت باری نے آپ کی ذات گرامی کو شرف اختصاص بخشا تھا۔ نجاشی حبش کو دعوت اسلام دینے کے بعد جو فرمان بارگاہ رسالت سے نافذ ہوا وہ خسرو پرویز کے نام تھا۔ اس وقت ہرقل اور خسرو کی طرف سے جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور خسرو اپنے خدم وحشم کے ساتھ کردستان کی سرحد پر دریائے فراسو کے کنارے خیمہ زن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت عبداللہ بن حذافہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر کوہ وصحرا قطع کرتے ہوئے خسرو کے دربار پہنچے اور نامہ مبارک پیش کیا جس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس
سلام علی من اتبع الھدیٰ وامن باللہ ورسولہ
واشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول الی الناس
کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان
ابیت فعلیک اثم المجوس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام اس شخص پر سلام ہے جو ہدایات کی پیروی کرے۔ اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس بات کی گواہی دے کہ بجز اللہ کے اور کوئی

معبود نہیں۔ اور نیز اس بات کی گواہی دے کہ میں تمام دنیا کے انسانوں کی
طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ ہر ذی حیات انسان کو اس کا خوف
دلاؤں۔ پس اگر تو اسلام لے آئے گا۔ تو سلامت رہے گا۔ لیکن اگر تو نے
انکار کیا تو مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہو گا۔

دولت کے نشہ کی ترنگ میں آ کر انسان بارہا اپنی ہستی بھول چکا ہے اور خود فراموشی کے عالم میں اسے اپنی بے مائگی پر اکثر خدائے بے ہمتا کی ہمپائگی کا دھوکا ہوا ہے چاند اور سورج سے اپنا سلسلہ نسب ملاتے ملاتے اس نے اپنے کو خود خداوند عالم کی اولاد بنا کر اپنے لئے وہ آسمانی حقوق تجویز کر لئے ہیں جن میں غیرتِ کبریائی کسی مخلوق کو تصرف کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یونان، روما، مصر، کالدیہ، ہندوستان سب کے سب کبر وپندار کی اس مرد افگن شراب کے متوالے ہو چکے تھے لیکن ایران کی سرمستیوں کا انداز ہی کچھ اور تھا تاجداران سلسلہ ساسانیہ اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کا شریک وسہیم سمجھتے تھے اور ان کی اس حیثیت کے اعتراف کے لئے ہر شخص کو ان کے دربار میں حاضر ہونے وقت انہیں سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ حاجی آباد کے پہلوی کتبہ میں جس پر ماہرین آثار عتیقہ کے اکتشافات نے روشنی ڈالی ہے۔ شاپور ساسانی کے القاب آج بھی ان الفاظ میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پرستار مزدیسنا الوہیت شاپور شہنشاہ ایران و ماورائے ایران از نسل
آفریدگار۔ پسر پرستار مزدیسنا الوہیت ارتخشتر شہنشاہ ایران از نسل آفریدگار
نبیرہ پکہ الوہیت شاہ بابک۔

پرویز ان ہی روایات کی گود میں پلا تھا اور اپنے کو اس دنیا کا دوسرا خدا سمجھتا تھا رسول اللہ کے نامہ مبارک پر نظر پڑی۔ تو اس کے آزادانہ لہجہ اس کے بے باکانہ ایجاز اور اس کے صاف گویانہ انتقاد کو دیکھ کر دنگ رہ گیا وہ جس کے آستانہ عظمت وجبروت پر لاکھوں انسان ناصیہ فرسائی کے خوگر تھے۔ حیران تھا کہ اس ربع مسکون میں کوئی ایسا گستاخ اور سرکش شخص بھی ہو سکتا ہے جسے اس کے نام سے پہلے اپنا نام لکھنے کی جرأت ہو۔ وہ جو طرابلس سے لے کر پنجاب تک شہنشاہ جہاں وجہانیاں اور خداوند عالم وعالمیان کہلاتا تھا سمجھ نہ سکتا

تھا۔ کہ کس طرح عرب کا ایک بادیہ نشین اس سے صرف رئیس فارس کہہ کر خطاب کر سکتا ہے قیصرِ روم اور خاقانِ چین کی متحدہ طاقت۔ ایشیا اور یورپ کی متفقہ سطوت اسے وہ دھمکی نہ دے سکتی تھی جو ان چند جلال آفرین الفاظ میں مضمر تھی۔

اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس

غضبناک ہو کر پکارا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہے۔ جو ہمارا غلام ہو کر ہم سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔ یمن کے صوبہ دار کو کہہ دو کہ اسے پکڑ کر ہمارے دربار میں بھیج دے۔ یہ کہہ کر مکتوبِ نبی کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ وہ رسولِ خدا کے مکتوب کی نہیں بلکہ خود اپنی سلطنت کی دھجیاں اپنے ہاتھ سے فضائے آسمانی میں اڑا رہا ہے۔

یمن کے ایرانی گورنر بازان نے جب مدینہ منورہ میں اپنے قاصد بھیج کر خسرو کے تہدیدی احکام سے حضورِ سرورِ کون و مکان کو اطلاع دی تو آپ نے صرف اس قدر فرمایا کہ اسلام عنقریب کسریٰ کے پایۂ تخت میں پہنچ جائے گا۔ کس قدر سچے الفاظ تھے جو جلی حرفوں میں خود خسرو کے خون سے مداین کے در و دیوار پر لکھے گئے۔

نینوہ کی شکستِ فاش کے بعد دوست دشمن سبھی کا یہ خیال تھا کہ نوشیروان کا پوتا اور کسی خیال سے نہ سہی آلِ ساسان کی شاندار روایات کا بھرم رکھنے ہی کے لئے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ کر مردانہ وار اپنے حریف کا مقابلہ کرے گا۔ اور اس آخری مقابلہ میں یا تو اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کرے گا یا قصرِ دستگرد کے کھنڈروں میں ڈھیر ہو کر آنے والی نسلوں کے لئے اپنی مردانگی کا افسانہ چھوڑ جائے گا۔ لیکن پیغمبر آخر الزمان کے مکتوب کے پرزے اپنے ساتھ اس امید کو بھی آبِ ترامسو کی نیلگوں موجوں میں بہا لے گئے تھے۔ وہ تلوار جو فلسطین اور مصر کے پرخچے اڑاتی ہوئی طرابلس کے سر پر جا چمکی تھی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ علم جو شام اور ایشیائے کوچک پر لہراتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا نصب ہوا تھا جھک چکا تھا۔ وہ محل جن کی بلندیاں فلک الافلاک کے آغوش میں ترببیت پذیر ہوئی تھیں۔ پست ہو کر خاک میں مل چکے تھے۔ خسرو پرویز اب خسران و ضلال اور یاس و قنوط کا محض ایک پیکرِ متحرک رہ گیا تھا۔ جس کی عزیمت سلب اور استقامت مفقود ہو چکی تھی۔ ہرقل کی آمد سے

نو دن پہلے اپنی چہیتی ملکہ شیریں اور دو کنیزوں کو ہمراہ لئے ہوئے اپنے محل کے چور دروازہ سے نکل کر وہ اس بے سرو سامانی سے مدائن کی طرف بھاگا۔ کہ چشم عبرت کھلی کی کھلی رہ گئی آخر جب پایہ تخت میں داخل ہو کر اس نے ہزاروں بندگان خدا کو اپنے سامنے سربسجدہ اور دجلہ کی موجوں کو اپنے اور رومی فوجوں کے درمیان حائل پایا تو ذرا اس کی جان میں جان آئی۔

پے در پے شکستوں اور تو بر تو ہزیمتوں سے اگرچہ ایران کی جارحانہ قوت ٹوٹ گئی تھی مگر پھر بھی اس کا مدافعانہ زعمہ بدستور قائم تھا۔ سلطنت کے مشرقی اور وسطی صوبوں کی طاقت ابھی تک دولت ساسانیہ کی دیوار اقتدار کی پشتیبان تھی۔ اور ہرقل اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ کسریٰ سے معقول شرائط پر صلح ہو جائے۔ دربار مدائن کے ساتھ مصالحانہ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے اس نے کئی بار نامہ و پیام بھی کیا۔ لیکن خسرو کی واژگوں طالعی نے اس زریں موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تقدیر کا گھڑیال بج چکا تھا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت بدبخت پرویز اور اس کی سلطنت کو تباہی سے بچا نہ سکتی تھی۔

ہرقل کی مراجعت کو غنیمت سمجھ کر خسرو نے ایک نئے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ لیکن وہ زمانہ خواب و خیال ہو چکا تھا۔ جب خسرو کے فرمان قضا نزاد سمجھے جاتے تھے۔ اور اس کے ایک اشارے پر سارے ایران کی گردن جھک جایا کرتی تھی۔ ملک پر سالہا سال سے جو تباہیاں نازل ہو رہی تھیں ان سب کی ذمہ داری رعایا کی نظروں میں اب صرف خسرو کی ذات تھی اور یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ خسرو سلطنت کے بہترین اغراض و مقاصد کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قربان کرنے سے کبھی باز نہ آئے گا یہی وجہ تھی کہ امتثال امر میں اس مرتبہ کسی جاں نثارانہ عقیدت کسی وفادارانہ سرگرمی کا اظہار نہ ہوا اور پایہ تخت کی آبادی کے ایک قلیل حصہ کے سوا کہ اس کا جزو غالب بھی غلام تھے نئی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے کسی نے آمادگی ظاہر نہ کی۔ اپنی بے اقبالی کا یہ کھلا ہوا ثبوت دیکھ کر اور رعایا کی روز افزوں بد دلی کے چرچے سن کر خسرو کا دل ٹوٹ گیا اور ناامیدی کے عالم میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سب سے زیادہ محبوب بیٹے مردانزدیہ کے حق میں تخت و تاج سے دست کش ہو کر زندگی کے باقی ایام گوشہ عافیت میں گزار دے۔ لیکن اس عافیت کا جنازہ تو نہ اٹھے گا اسلام

کی غیرت کے کندھے پر اسی دن نکل چکا تھا۔ جب خسرو نے پیغمبر آخر الزمان کے مکتوب کے پرزے اڑائے تھے۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

خسرو کے بڑے بیٹے شیرویہ نے جو شیریں کے بطن سے تھا۔ خلف اکبر ہونے کی بنا پر اس فیصلے کو غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے امرائے سلطنت کے ساتھ جوڑ توڑ شروع کر دیئے۔ اور رعایا کے تمام طبقوں کو چپکے چپکے اپنا طرف دار بنا لیا۔ امرا کو اس امید نے اس کی طرف جھکا دیا کہ ایک جواں سال تاجدار کی نئی نئی حکومت دولت اور عزت کی نئی نئی راہیں ان کے لئے کھول دے گی۔ فوج کے افسر اور سپاہی اس وعدے سے خوش ہو گئے کہ ان کی تنخواہیں بڑھا دی جائیں گی۔ عیسائیوں کو کامل مذہبی آزادی کے عطیہ کی خوش خبری سنائی گئی اور قوم کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ رومیوں کے ساتھ فوراً با آبرو صلح کر لی جائے گی اور محصولات گھٹا دئے جائیں گے۔

اس وسیع سازش کا جال پھیلا کر جب شیرویہ نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ تو خسرو کے طرف دار بھی جو آٹے میں صرف بقدر نمک کے رہ گئے تھے۔ زمانہ کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر اس کے ساتھ مل گئے۔ بے یار و مددگار خسرو نے پایہ تخت سے بچ نکلنے کی کوشش کی لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ شیرویہ کے حکم سے اس کے اٹھارہ بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کئے گئے۔ پھر وہ خود ایک تیرہ و تار زندان میں جھونک دیا گیا جہاں سفاک بیٹے کے ایما پر شکنجہ کے گوناگون عذاب کے ساتھ مسلسل پانچ دن کی گرسنگی و تشنگی کی عقوبتوں نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

نوشیرواں نے اپنے قصر دولت کے جن چودہ کنگروں کو خواب میں گرتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ابھی دو ہی منہدم ہوئے تھے لیکن باقی بھی جلد ہی سرنگوں ہو جانے والے تھے۔ شیرویہ سے لے کر یزدجرد تک بارہ ساسانی تاجداروں

نے صرف نو سال کا زمانہ پایا۔ جس کے خاتمہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اقدس کے مطابق اسلام کسریٰ کے پایہ تخت تک جا پہنچا۔ اور حضرت سعد وقاص یہ آیات پڑھتے ہوئے ساسانیوں کی دولت سرا میں داخل ہوئے۔

کم ترکوا من جنات وعیون و
زروع ومقام کریم ونعمۃ
کانوا فیہا فاکہین ۵ کذالک
واورثناہا قوماً آخرین ۵

روزنامہ "زمیندار"
۲۹ مارچ ۱۹۲۹ء

مسلمانوں کا سیاسی مستقبل

ہوا مخالف و شب تار و موج طوفان خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیان ہند کی طوفان زدہ کشتی کے چند ناخدا جن کا خیال ہے کہ ہمارے بازوؤں کی توانائی ہی اس لنگر گسستہ زورق کو بھنور سے نکال کر ساحل نجات پر پہنچا سکتی ہے۔ دہلی میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور بعض ہنود سے جن کی سربر آوردگی کا بھانڈا مالوی جی اور ان کی کثیر الانفار اُمت کے ہاتھوں بنارس کے چوراہے میں مدت کا پھوٹ چکا ہے، تبادلہ خیالات کرنے کے بعد سات کروڑ مسلمانوں کو اپنا یہ ناگہانی فیصلہ سنا دیا۔

(۱) سندھ احاطہ بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے۔

(۲) صوبہ سرحد شمالی و مغربی اور صوبہ بلوچستان میں بھی وہی اصلاحات رائج ہوں جن سے ہندوستان کے دوسرے صوبے متمتع ہیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں اساس نیابت آبادی کا تناسب ہو۔

(۴) مجلس وضع آئین و قوانین کی مرکزی مجلس میں اسلامی نمائندگی کا عنصر ایک ثلث سے کم نہ ہو۔

(۵) اگر ہنود کو یہ چاروں شرطیں منظور ہوں اور وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر حکومت کا سران مطالبات جبار گانہ کے آگے جھکانے پر آمادہ ہوں تو مسلمانان ہند تیار ہیں کہ جداگانہ انتخاب کی جگہ جو آج تک سیاسیات میں ان کا اصل الاصول چلا آیا ہے۔ ہندوستان بھر کے لئے مخلوط انتخاب کا طریقہ اختیار کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ اور ان صوبوں میں جہاں ان

کی اکثریت ہوگی ہندو اقلیت کو وہی مراعات دیں جو ان کی اقلیتوں کو دوسرے صوبوں میں ملیں جہاں ہندو آبادی کا عنصر غالب ہے۔

مسٹر محمد علی جینا صاحب جن کی سرکردگی اس غیر متوقع فیصلہ کی ذمہ دار ہے مسلمانان ہند کی رائے عامہ سے استصواب کرنا اگر ضروری نہیں سمجھا اور اپنے چند رفیقوں کے ساتھ بند کمرہ میں بیٹھ کر ان مسائل کا ایک مفاجاتی حل خود ہی تجویز فرمالیا جن کے ساتھ ساڑھے کروڑ بندگان خدا کی موت وحیات وابستہ ہے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے۔ ہندو سالہا سال سے شور مچا رہے تھے کہ قومیت متحدہ کے رستہ میں صرف جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب حائل ہیں۔ جب تک مسلمان اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ قانون ساز مجلسوں میں ان کے نمائندے اپنے حلقہ کے ہندوؤں کا پروانۂ خوشنودیٔ مزاج لے کر داخل ہوں، قوم ایک نہ ہوگی اور ملک میں امن وامان قائم نہ ہوگا۔ طول وعرض ہند میں آج جتنے خونریز ہنگامے بپا ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو جان گسل کشمکش جاری ہے کوہاٹ سے لے کر مالابار تک اور لاڑکانہ سے چل کر بار لیسال تک جو زہر ہندوستان کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے، ان ساری خرابیوں کا سرچشمہ جداگانہ طریقہ انتخاب ہے اگر مسلمان اپنی ضد چھوڑ دیں اور مخلوط انتخاب کی تجویز قبول کرلیں تو سارے فتنے یک قلم مٹ سکتے ہیں اور سوراج چٹکی بجاتے میں ملا جاتا ہے۔ یہ چلتا ہوا منتر اتنی مرتبہ پھونکا گیا اور اس زور وشور سے پھونکا گیا کہ مسٹر جینا اور ان کے ساتھی سینہ میں چھٹی صدی کا دل اور سر میں بیسویں صدی کا دماغ رکھنے کے باوجود مسحور ہو گئے یہ نہ سوچے کہ غولِ بیاباں کی فریبندگی ان کی پیاس کو جس لہراتی ہوئی موج سے بجھانا چاہتی ہے

——— وہ موج آب نہیں بلکہ موج سراب ہے۔

تعلیم میں پسماندہ، تجارت میں درماندہ، سیاسیات میں اگر بزدلی کے وبال اور اقتصادیات میں ہندوؤں کے کنونڈے مسلمانوں نے جب اپنی مٹتی ہوئی ہستی کو برقرار رکھنے کے خیال سے اپنے لئے جداگانہ انتخاب کا مسلک تجویز کیا تھا تو کچھ سوچ سمجھ کر کیا تھا ۱۹۰۶ء میں اگر اس بات کی ضرورت تھی کہ اورنگ زیب اعظم کے نام لیواؤں کا رہا سہا

وقار سیواجی کے جانشینوں کی نوزائیدہ ہوس اقتدار میں جذب ہو کر ہندوستان کے صفحہ سے ہمیشہ کے لئے محو نہ ہو جائے تو آج وہ ضرورت سو گنا زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ گاندھی کی راکھ جلد دہلی کی ہوا اڑا لے گئی۔ واس کے پھول گنگی کی موجیں بہا لے گئیں۔ نہرو کا اثر تریبنی میں غرق ہو گیا۔ اب تو مالوی ہیں، مونجی ہیں، یا لاجپت رائے ہیں جن کے اشارہ پر جاتی ناچتی ہے اور پکار پکار کر یہ کہتی ہوئی سنی جاتی ہے کہ مسلمان یا تو شدھ ہو کر ہم سے آملیں یا ہمارے غلام ہو کر رہیں۔ اس کے سوا ملک میں ان کا اور کوئی مستقبل نہیں۔

غلامی سے یہی مراد نہیں کہ آقا کے لئے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائی جائیں۔ محلہ کے کنویں سے پانی بھرا جائے۔ جھاڑو ہاتھ میں لے کر حویلی کا آنگن صاف کیا جائے۔ اگرچہ ڈاکٹر مونجی اس لفظ کو غالباً انہیں معنوں میں محدود کر دینا چاہتے ہوں گے اور ان کا بس چلے گا تو مسلمان یہ دن بھی دیکھ لیں گے جس غلامی کا حلقہ ہندو مہاسبھا کہ اسی کی آواز آج تینتیس کروڑ ہندوؤں کی آواز ہے، مسلمانوں کے کان میں ڈالنا چاہتی ہے وہ ڈولیاں ڈھونے جھاڑو دینے پانی بھرنے اور لکڑی کاٹنے کی رذیلانہ نسبتوں سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنے ضمیر کی آزادی کھو بیٹھیں اور ان اقتصادی و سیاسی حربوں کی بے پناہ ضرب سے بے دست و پا ہو کر جن کی ہنود کے جدید اسلحہ خانے میں کوئی کمی نہیں، اپنے آقاؤں کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں سے اپنے حقوق کی حفاظت کی توفیق چھین لی جائے اور اپنی قوم کی نمائندگی کی جگہ وہ ہنود کے مفاد کی نمائندگی کرتے ہوئے دیکھے جائیں۔ وہی زبان سے نکالیں جس سے ہنود خوش ہوں وہی رویہ اختیار کریں جس کی انہیں پہلے سے ہدایت کر دی گئی ہو۔ اس ہولناک سیاسی غلامی سے آج تک انہیں جداگانہ انتخاب نے بچائے رکھا۔ ان کے حلقہ ہائے انتخاب علیحدہ ہیں وہ اپنی جماعت کے اسی شخص کو کونسلوں میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتے ہیں جس پر انہیں اعتماد ہو اور وہ بھی اصولاً ان کے مفاد کی نگہداشت پر مجبور ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا انتخاب صرف انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج ہوتے ہی اس کی اکس مسئولیت پر معاً ہندو رائے دہندوں کا حق قائم ہو جائے گا۔ جس کے تفوق کا برقرار رکھنا

روپیہ والی ہندو جاتی، اثر والی ہندو جاتی، سیاسی ہتھکنڈوں والی ہندو جاتی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ یہ تلخ حقیقتیں جن کا مسلمانوں کو آئے دن تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ اس درجہ پیش پا افتادہ ہیں کہ ان کی توضیح پہ قلم اٹھانا وقت کا خون کرنا ہے لیکن مسٹر جناح اور ان کے رفیقوں کی عقلوں پہ کچھ ایسے پتھر پڑ گئے کہ حریفان شاطر کی ایک معمولی سی چال کو بھی نہ سمجھ سکے۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں کی عاقبت نا شناسی نے ان مشکلات کا صحیح صحیح اندازہ نہ کیا تھا جو قدم قدم پر ان کا سنگ راہ ہونے والی تھیں۔ انہوں نے کانگریس کے چند رہنماؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی طرف سے مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا تھا اور اس زہر کے لئے جو ملک کی موجودہ مسموم فضا نے اس میں بھر رکھا ہے اس امید موہوم پر چند شرائط کا تریاق بھی تجویز کر لیا تھا کہ کانگریس کی حمایت سارے ہندوؤں کو ان کے فیصلہ کے آگے جھکا دے گی اور مسلمان بھی یہ دیکھ کر کہ چند نئے صوبے ان کے ہاتھ آئے جاتے ہیں۔ جہاں ان کی اکثریت کو فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں گے بخوشی اس فیصلہ پر رضامند ہو جائیں گے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے اس دل خوش کن خیال کی عمر چند گھنٹے سے زیادہ نہ نکلے گی۔

۲۰؍ مارچ کو مسٹر جناح نے راج سبھا میں اس فیصلہ کا اعلان کیا۔ ۲۱؍ مارچ تک کانگریس کے ذمہ دار عہدہ داروں کی حمایت اس کی پشتیبان رہی اور مسٹر سرینواس آئنگر، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو اور محمد علی صاحب مدیر "ہمدرد" کو یہ خدمت بھی سونپی گئی کہ مسلمان اور ہندو اکابر کے ساتھ مل کر تفاصیل پر بحث کر لیں۔ لیکن یہ دن بمشکل گذرنے پایا تھا کہ ہندو دنیا میں خطرہ کی گھنٹی زور زور سے بجنا شروع ہو گئی اور سب سے اول ۲۱؍ مارچ کو پنجاب ہندو سبھا نے کانگریس کے اس دخل در معقولات کے خلاف ایک زبردست قرارداد میں آواز بلند کی جس کا مفاد حسب ذیل تھا۔

> نیشنل کانگریس ہندو قوم کی نمائندہ نہیں ہے وہ کسی اسلامی جماعت کے ساتھ کسی ایسے مسئلہ پر جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفاد یکساں وابستہ ہوں گفت و شنید کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ کانگریس کے رہنماؤں میں

مسلمان بھی شامل ہیں جن کے فیصلوں کی پابندی ہندوؤں پر عائد نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں صرف ایک جماعت ایسی ہے جو دونوں قوموں کے مابہ النزاع مسائل پر مسلمانوں سے گفت و شنید کرنے اور کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کا حق رکھتی ہے اور وہ جماعت ہندو مہاسبھا ہے۔

یہ آواز جو اصلی معنوں میں جاتی کی آواز تھی اپنا کام کر گئی اور دوسرے ہی دن مہاسبھا کے کرتا دھرتا پنڈت مالوی جی کے زیر صدارت لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ہندو اراکین کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں مسٹر جناح کی پیش کردہ تجاویز پر غور کیا گیا۔ اور ذیل کے عام اصول تسلیم کر لئے گئے جن پر مسلمانوں کے ساتھ بحث و تمحیص ہو سکتی تھی۔

۱:۔ ملک کی تمام مجالس وضع آئین و قوانین کے لئے مخلوط انتخاب کا طریقہ ایک اصول موضوعہ کے طور پر جس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں قبول کر لیا جاتا ہے۔

۲:۔ تمام مجالس وضع آئین میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نشستیں محفوظ کی جائیں۔

۳:۔ مذہبی اور رسیم مذہبی حقوق کی حفاظت کا آئینی طور پر انتظام کیا جائے

۴:۔ زبان کے لحاظ اور دوسرے ضروری مراتب کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبوں کی نئی تقسیم کا سوال ہندوؤں سے مشورہ کرنے کے بعد مزید غور کے لئے چھوڑ دیا جائے

مسٹر جناح اور ان کے رفیقوں کو ہوا کا رخ اب معلوم ہو چلا۔ مالوی جی ان کی اس تجویز کا خیر مقدم کرنے کو تو صدق دل سے تیار تھے کہ مسلمان مخلوط انتخاب کی چکی کا پاٹ اپنی گردن میں ڈالیں لیکن دوسری شرطیں جن سے مسلمانوں کو تھوڑا بہت فائدہ پہنچنا نظر آتا تھا ان کے نزدیک ہرگز قابل پذیرائی نہ تھیں ان کے دست راست لالہ لاجپت رائے نے ۲۷ مارچ کو ہندو جاتی کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے صاف فرما دیا کہ:۔

میں خوش ہوں کہ مسلمانوں نے تمام ہندوستان کے لئے مخلوط انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا مگر مسٹر جناح نے جن چند شرائط سے اسے مشروط کر دیا

ہے وہ مزید غور و بحث کی محتاج ہیں صوبوں کے از سر نو تقسیم کئے جانے کا سوال اس قدر سیدھا سادھا نہیں جتنا کہ بعض اصحاب کو بظاہر نظر آتا ہے۔ نہ یہ سوال آسان ہے کہ صوبہ سرحدی کے لئے کس قسم کی حکومت ہونی چاہیئے۔

راجہ نریندر ناتھ صاحب نے جو منگمٹن کے آسمان کے ایک اور چمکتے ہوئے تارے ہیں تین دن بعد بمبئی سے صوبہ سندھ کی علیحدگی کے مسئلہ پر اظہار خیالات کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

اس سوال کا فیصلہ کرتے وقت نہ صرف مسلم آبادی کے خیالات بلکہ ہندو آبادی کے خیالات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔

اسے اتفاق کہیئے یا راجہ نریندر ناتھ کی صاحب دلی کا فیضان کہ ادھر یہ لفظ ان کے منہ سے نکلے اُدھر سندھ کی ہندو آبادی نے اپنے خیالات کی "ملحوظیت" کے لئے مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو رشدھ کرنا شروع کر دیا جس پر لاڑکانہ میں لاٹھیاں چل گئیں سینکڑوں مسلمان قید ہو گئے اور راجہ صاحب کو یہ تراشا یا عذر ہاتھ آگیا کہ وہ علاقہ جس میں اسلامی اکثریت ہندوؤں پر ایسے ایسے ظلم کر رہی ہو کس طرح بمبئی کے آغوش عاطفت سے جدا کر کے مسلمانوں کے حاکمانہ رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ رہی سہی کمی کراچی کے مہاجنوں نے یہ قرارداد منظور کر کے پوری کر دی کہ ہم قیامت تک بمبئی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیئے۔

یہ تو سندھ کا حشر ہوا۔ رہ گئی صوبہ سرحد شمالی و مغربی میں اصلاحات کی میخ کہ یہ بھی مسٹر جناح نے اپنے مخلوط انتخاب والے اونٹ کے گلے میں لٹکا دی تھی۔ سو لالہ لاجپت رائے جن کے سینے پر دن کے وقت بھی امان اللہی نرکتاز کا خیالی کابوس سوار رہتا ہے پہلے ہی فرما چکے ہیں کہ اس صوبہ میں قیامت تک موجودہ وضع کی نیم فوجی حکومت ہی قائم رہنی چاہیئے پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے کانگرسی رفیقوں سے تھوڑی بہت توقع ہو سکتی تھی۔ کہ وہ مسٹر جناح کے ساتھ مل کر انگریزوں پر زور ڈالیں گے کہ صوبہ سرحدی کو بھی وہی ایسی

مراعات دی جائیں جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں لیکن جب ایک دفعہ وہ اسمبلی میں اپنا رسوائے عالم مسلک ظاہر کر چکے ہیں تو اب کس منہ سے اپنے طے کئے ہوئے اصول کو جھٹلائیں گے۔

کانگرس کا وقار مسٹر جناح و خضر کا کے فیصلہ کی پیٹھ پر جو تھپکی دے سکتا تھا۔ اس کا حشر تو عالم آشکارہ ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی تھا کہ ہندو مہاسبھا جس کے "مزید غور" کے لئے مالوی جی نے مخلوط انتخاب کی ٹیڑھی شرائط کو ابھار رکھا تھا کیا فرماتی ہے جاتی کی نیتوں کی اس سب سے بڑی ترجمان نے ۸ ار اپریل کو اپنا حکم سنایا کان کھول کر سنئے۔

۱۔ بعض مسلمان لیڈروں نے گزشتہ مارچ میں بعض تجاویز منظور کی تھیں۔ ہندوؤں نے متعدد مقامات پر ان کے خلاف اظہار ناراضگی کیا مسٹر محمد علی جناح نے کہا ہے کہ ہندو یا تو ان تجاویز کو منظور کریں یا مسترد کر دیں۔ مگر ہندو مہاسبھا اس وقت اس بارہ میں کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتی۔

۲۔ ہندو مہاسبھا ان تمام کوششوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جو کسی حصہ ملک کو اس بنا پر جداگانہ صوبہ بنانے کے لئے عمل میں لائی جائیں۔ کہ کسی خاص جماعت کو زیادہ حقوق نیابت حاصل ہو سکیں۔

۳۔ مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر ہندو مہاسبھا کی رائے میں حالات نے ہنوز وہ صورت اختیار نہیں کی کہ مہاسبھا ان مسائل پر بحث کر سکے۔ یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان پر غور کرے۔ اس لئے کہ موجودہ حالات کے اندر ان مباحث میں حصہ لینا قبل از وقت اور نقصان رساں ہوگا۔

۴۔ البتہ مندرجہ ذیل اصول کے ماتحت ہندو مہاسبھا بحث میں حصہ لینے کو تیار ہے۔

(ا) تمام مجالس وضع آئین و قوانین میں مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج ہو۔

(ب) تمام ایسی مجالس میں کسی خاص عدت کے لئے نشستیں محفوظ رکھی جائیں

لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آبادی کا تناسب۔ آرا کی تعداد اور رائے
دھندوں کی قابلیت ادائے ٹیکس ایسی نشستوں کی تعیین کا اساس
تسلیم کر لیا جائے۔

(ج) تمام صوبوں میں رائے دہندگی کے حقوق کا معیار ایک ہی قرار
دیا جائے۔

ہندو مہاسبھا کا یہ فیصلہ اپنا شارح آپ ہے۔

ہندو مہاسبھا نے مسٹر محمد علی جناح کی تجاویز کے ان حصوں کو جن سے مسلمانوں کے مفاد کی تھوڑی بہت نگہداشت ہوتی تھی۔ سراپا استحقار سے ٹھکرانے وقت جس عناد آلود جذبہ کا مظاہرہ کیا اس کی تصویر ڈاکٹر منجی نے اپنے طول وطویل خطبہ صدارت میں کھینچی ہے خرافات وہفوات کی اس زہریلی پوٹ پر تفصیلی تبصرہ کے لئے تو ہمیں عمر نوح (اور قارئین کرام کو صبر ایوب) کی ضرورت ہوگی۔ لیکن چند الفاظ میں اس کا ملخص یوں پیش کیا جاسکتا ہے

مظلوم ہندوؤں میں ایکا نہیں یکجہتی نہیں۔ غیروں کے مقابلہ میں پوری قوت کے ساتھ ڈٹ جانے کا ولولہ نہیں۔ پان اسلامزم کے جوش سے بھرے ہوئے مسلمان غنڈے ان کے مذہبی جلوسوں میں خلل ڈالتے ہیں۔ ان کے مندروں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ ان کی جائدادیں دن دہاڑے لوٹتے ہیں، ان کی عورتوں کی عصمت جبراً بگاڑتے ہیں۔ ان غنڈوں نے حکومت کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے جو ہندوؤں کی دردناک فریادوں کی طرف سے کان میں بے اعتنائی نفرت کی روئی ٹھوس لیتی ہے اور اس طرح ان کے ستانے والوں کے حوصلے روز بروز بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کی ان ساری مصیبتوں کا علاج فقط سوراج ہے اور سوراج کا راز شدھی اور سنگھٹن میں چھپا ہوا ہے۔ مسلمان دل سے کبھی کانگرس کے ساتھ نہ ہوئے اور نہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انہوں نے کبھی بھارت کو بدیسیوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہا، وہ تو صرف حکومت کے خوان کرم کے چند ریزوں

پر قناعت کئے بیٹھے ہیں یا کے مدینے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ ہندوستان ہمیشہ کے لئے انگریزوں کا غلام نہیں رہ سکتا۔ ان کی گرفت سے اسے چھڑانا اب ہمارا کام ہے اور یہ کروڑوں شدھی اور سنگھٹن کے بل پر ہندوؤں ہی کو دلنی ہوگی جس قدر زیادہ شدھی اور سنگھٹن پر اپنی قوت کو صرف کریں گے اسی قدر وہ سوراج کی صبح کے طلوع کو قریب تر لے آئیں گے جس پر ان کی آئندہ نسلیں فخر کریں گی اس وقت ہندوؤں کو دو بلاؤں نے گھیر رکھا ہے۔ ایک انگریزوں کی مشین گن، دوسری مسلمان غنڈوں کی لاٹھی ان دونوں بلاؤں سے انہیں نجات دلانے کے لئے ہندو مہاسبھا نے شدھی اور سنگھٹن کا دہرا حربہ ایجاد کیا ہے جسے بے پناہ ثابت کر دکھانا جاتی کا کام ہے۔

"مسلمان صرف سات کروڑ ہیں اور ہندو تیئیس کروڑ۔ ان پر سات سمندر پار سے آکر ایک ایسی قوم مسلط ہو گئی ہے جس کی تعداد پانچ کروڑ سے زیادہ نہیں۔ ہندو ذہانت اور دلیری اور تجارتی فہم و فراست میں فرداً فرداً کسی انگریز سے کم نہیں انگریز قلت تعداد کے باوجود اس لئے ہندوستان کے مالک بنے بیٹھے ہیں کہ ان کی قوت منظم ہے ہندو اگر سنگھٹت ہو جائیں تو انگریزوں اور ان کے مسلمان پٹھوؤں کو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر نیچا دکھا کر سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔ مسٹر جینا کی تجاویز منتقمانہ مقابلہ کی دھمکی دے رہی ہیں جس کی ہندوؤں کو کوئی پرواہ نہیں۔ ہندوؤں کو یہ پرانا خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ مسلمانوں کی مدد کے بغیر سوراج کا حاصل ہونا محال ہے آج سے ان کی حکمت عملی یہ ہو گی کہ مسلمانوں کو اپنے حال پر اور انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تا آنکہ انہیں اپنی حماقت کا احساس ہو اور وہ ذلیل ہو کر ہمارے قدموں پر آگریں اور سوراج کی جدوجہد میں کوئی قابو چیانہ شرط پیش کئے بغیر ہمارا ہاتھ بٹانے لگ جائیں۔ وہ اتحاد زیادہ محکم اور زیادہ دیرپا ہوگا۔ ہندو آج سے اپنی دنیا الگ بسائیں گے اور شدھی اور سنگھٹن سے اس کارخانہ کی رونق ہو گی۔"

"ٹائمز آف انڈیا" لکھتا ہے کہ "اگر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ڈاکٹر منجی جیسے اشخاص ہی کے صلاح و مشورہ پر موقوف ہے تو مستقبل کے تاریک ہونے میں کلام نہیں۔" اسی طرح

"انڈین نیشنل ہیرلڈ" نے بھی حسرت کے لہجہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "مخلوط انتخاب کی تجویز پر رائے زنی کرتے ہوئے ڈاکٹر منجی نے جو غیر مآل اندیشانہ روش ظاہر کی ہے اگر وہی روش ہندو مہاسبھا کی بھی ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندو رہنماؤں کے عقل و تدبر کا دیوالیہ نکل گیا" "ٹائمز آف انڈیا" ایک اینگلو انڈین اخبار ہے جس کی ہر بات بدنگاہ اشتباہ ہی دیکھی جانی چاہیئے۔ "انڈین نیشنل ہیرلڈ" کے مدیر مسٹر ہارنی مین اگرچہ ہندوستان کے ساتھ محبت رکھتے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ مسٹر سرینواس آئنگر صدر کانگرس کی آواز بازگشت سمجھے جا سکتے ہیں جس کو آج کل کوئی پوچھتا نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں نے ڈاکٹر منجی اور ان کی ہندو مہاسبھا کی جدید حکمت عملی کا استقبال کس طرح کیا۔ ملک کا کوئی با اثر ہندو حلقہ ایسا نہیں جس نے ہندو مہاسبھا کی اس اسپیچ پر اظہار مسرت و اطمینان نہ کیا ہو۔ "پرتاپ" "ملاپ" "بندے ماترم" "تیج" اور اسی وضع و قماش کے دوسرے سنگٹھنی اخبار تو ہندو مہاسبھا کے نئے پیغام عمل پر جس قدر خوشی کریں جتنا بھی ناچیں کم ہے۔ خود ولیش بندھو داس آنجہانی کا اخبار "فارورڈ" بھی جو سارے قوم پرست بنگالی ہندوؤں کی آواز ہے، ڈاکٹر منجی کی صاف گویانہ جرأت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ "فارورڈ" کے حسب ذیل الفاظ ہنود کی موجودہ ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔

> ڈاکٹر منجی کی مطبوعہ تقریر کے حسن و قبح کے بارہ میں خواہ کچھ ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس دقیانوسی عقیدہ کے پرخچے اڑانے میں دلیری سے کام لیا ہے کہ ہندوستان کو اس وقت تک سوراج نہیں مل سکتا جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ایک امر واقعہ نہ ہو جائے۔ ڈاکٹر منجی کے دعویٰ میں ظاہر بینوں کو خامیاں نظر آئیں گی لیکن جو لوگ سوراج کے شیدائی ہیں، ان کے غور و فکر کے لئے اس دعویٰ نے بہت کچھ مسالہ بہم پہنچا دیا ہے۔

اب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ہندو جاتی کیا چاہتی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کا اتحاد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ مخلوط انتخاب کے اصول کو تسلیم کر کے اپنی داڑھی اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے ایک جداگانہ صوبہ قائم کرنے کے

خیال خام سے باز آجائیں۔ صوبہ سرحد شمالی و مغربی میں اصلاحات کی ترویج کے بیہودہ مطالبے سے دست کش ہو جائیں۔ بنگال اور پنجاب میں اپنی اکثریت کا ڈھول پیٹنا چھوڑ دیں۔ سرکاری ملازمتوں میں جن کا معیار صرف مالویانہ قابلیت۔ ہے اپنی ہو یا نہ جہالت کا تناسب قائم کرنے کی حماقت میں مبتلا نہ ہوں۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمان کیا کریں۔ محمد علی صاحب مدیر "ہمدرد" نے اسی سوال کو یوں پیش کیا ہے۔

> اصل مشکل یہ ہے کہ جب تک ہند میں مسلمان اقلیت میں ہوں اور ہندو اکثریت میں اور دونوں ملتوں کی ذہنیت ایسی ہو کہ ایک دوسرے کو دشمن سمجھے اور ہندو اکثریت کے انصاف اور رواداری پر مسلمان اقلیت کو بالکل بھروسہ نہ ہو، مگر فیصلہ ہر امر میں اکثریت ہی کے موافق کیا جائے تو مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کیونکر کیا جائے؟

یہی مشکل تھی جس نے مسٹر جناح اور ان کے رفیقوں سے ۲۰ مارچ والا فیصلہ نافذ کرایا اور محمد علی صاحب سے جن کو "ہندو جاتی کی قوم پروری" پر ابھی تک تھوڑا بہت اعتماد تھا یہ کرب آلود تمنا ظاہر کرائی کہ

> ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کا یہ فیصلہ بہت ممکن ہے کہ ایک تاریخی فیصلہ ہو جائے۔ خدا ہندو مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اسے قبول کریں۔

ہندو مہاسبھا کی چنگیزیانہ ذہنیت نے آج اس مشکل کو چہار چند کر دیا ہے۔ اور ہندو جاتی کی قوم پروری کا بھانڈا خود محمد علی صاحب کو مجبوراً پھوڑنا پڑا ہے۔

مسلمان پہلے ہی سے ۲۰ مارچ والے جینائی فیصلہ کے خلاف تھے۔ اب انہیں متفقہ طور پر عزم بالجزم کر لینا چاہیئے کہ اس ملک میں ان کا سیاسی نصب العین کیا ہو۔ اور ان ذلتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جو ہندو مہاسبھا کے شدھی باز سنگھٹنیوں نے ان کے لئے تجویز کی ہیں ان کا آئندہ مسلک کیا ہونا چاہیئے۔ وہ اچھی طرح سے جان لیں کہ امت مالوی نے اپنی ہزار سالہ روایات کا ادب کرتے ہوئے ہمیشہ کے واسطے برطانیہ کی غلامی

کا حلقہ اپنے کانوں میں ڈال لیا ہے۔ جس سوا راج کا خواب وہ دیکھ رہی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ انگریزی جھنڈے کے سایہ تلے اس ملک کے تمام وہ حقوق جو ایک غلام قوم کو مل سکتے ہیں صرف اسی کے حصہ میں آجائیں۔ ہندوستان کا آزاد کرنا صرف مسلمانوں کا کام ہے یا ان ہوش مند ہندوؤں کا جو مہاسبھائیوں سے الگ ہو کر ان کے شریک کار ہونا پسند کریں۔ ان میں سے ایک ایک کبھی ہزار ہزار پر بھاری رہ چکا ہے۔ وہ تو اس ملک میں سات کروڑ ہیں اور اگر ارادہ کر لیں تو گنگا کو اپنی چھڑی کے ایک اشارہ سے الٹا بہا سکتے ہیں ہمالیہ کو اپنے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے پیوند زمین کر سکتے ہیں۔

ہندوؤں کے نوزائیدہ جذبۂ غیرت کو اگر مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل میں عار ہے تو ہوا کرے۔ انہیں اس کی کچھ پروا نہیں۔ وہ بھی غیرت رکھتے ہیں اور اس غیرت کی بجلی ایک ہزار سال تک مالوی اور مونجی اور لاجپت رائے کے بزرگوں کی آنکھوں کو چندھیاتی رہی ہے۔ اور خدا نے چاہا تو اب ان کو اور ان کی آئندہ نسلوں کو چندھیائے گی۔ مسلمانوں کے پہلو میں دل ہے، دل میں خدا کا نور ہے اور اس نور کی روشنی میں انہیں اپنا مستقبل صاف نظر آ رہا ہے۔ وہ ایک ہو جائیں اور اس حریت کاملہ کے انتظار میں جو ان کی قوت بازو کے صدقہ میں ایک نہ ایک دن ہندوستان کو حاصل ہو کر رہے گی۔ سردست ذیل کا سیاسی لائحہ عمل اپنی نظر کے سامنے رکھیں۔

۱۔ سارے ملک میں جداگانہ طریقۂ انتخاب رائج رہے تاآنکہ ہندو اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں کہ مسلمانوں کو ان پر اعتماد ہو سکتا ہے اور اس وقت انہیں اختیار ہو کہ مقامی حالات کے لحاظ سے جہاں اور جب چاہیں مخلوط نیابت کا طریقہ اختیار کر لیں۔

۲۔ صوبجات کی کونسلوں میں نمائندگی کا اساس آبادی کا تناسب ہو اور نشستیں ہر جماعت کے تناسب کے لحاظ سے محفوظ کی جائیں۔

۳۔ لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں نمائندگی بہ اعتبار تناسب ـــــ آبادی نہ ہو بلکہ بلحاظ صوبجات ہو۔ ہر صوبہ سے مسلمانوں اور نامسلمانوں کی ایک مقررہ

تعداد مساویانہ نسبت سے بھیجی جائے۔ تاکہ مرکزی مجالس میں ہندوؤں کی وہ خوفناک اکثریت جو ساڑھے سات کروڑ بندگانِ خدا کی عافیت تنگ کر کے ان میں دائمی بددلی پیدا کر سکتی ہے قائم نہ رہنے پائے اور مسلمانوں کو اطمینان ہو جائے کہ اس ملک کے مفاد میں ہم بھی ہندوؤں کے برابر کے شریک ہیں۔

۴:- سندھ بمبئی سے علیٰحدہ کر کے ایک جداگانہ صوبہ قرار دیا جائے۔

۵:- صوبہ سرحد شمالی و مغربی کی قانونی حیثیت وہی ہو جو دوسرے صوبجات کی ہے۔

۶:- صوبجات کی مجالس وضع آئین و قوانین کی مختص الجماعت نشستوں کی طرح سرکاری ملازمت میں بھی آبادی کا تناسب ملحوظ رکھا جائے۔

یہ مطمحِ نظر ذرا بلند ہے اور ہندو مہاسبھا کے حلقوں میں تو اس کے تصور ہی سے کہرام مچ جائے گا۔ لیکن ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کی عزیمت کی رسائی سے کچھ دور نہیں۔

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق
باشد بقدرِ ہمتِ تو پایگاہِ تو

روزنامہ "زمیندار"

۲۴ر اپریل ۱۹۲۷ء

ایشیا میں برطانیہ کی حکمتِ عملی کا مدوجزر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیٹر اول زار روس جس کے زمانہ سے سلافی نسل کے مقابلہ میں ترکوں کے حقیقی مصائب کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور جس کی غاصبانہ دستبرد نے ۱۷۲۳ء میں ایران سے داغستان مازندران اور استرآباد کے صوبے چھین کر وسط ایشیا میں اس پیشقدمی کا ڈھنگ ڈال دیا جو پونے دو سو سال تک کسی طاقت سے نہ رک سکی۔ مرتے وقت اپنے جانشینوں کو ایک وصیت کرتا گیا تھا۔ جس کا فقرہ ذیل تاریخی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

جہاں تک ممکن ہو ہندوستان اور قسطنطنیہ کے قریب پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ قسطنطنیہ وہ شہر ہے۔ کہ جس تاجدار کو اس کی حکومت ہاتھ آئے گی۔ وہی ساری دنیا کا فرمانروا ہوگا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ کہ ترکی اور ایران کے ساتھ حرب و قتال کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رکھا جائے۔ تاکہ ان دونوں ملکوں کو دم لینے کی فرصت نہ ملے بحیرۂ اسود میں جہاز سازی کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ اور رفتہ رفتہ اس سمندر اور نیز بحیرۂ بالٹک پر قبضہ جما لیا جائے۔ کہ دو گونہ تسلط ہمارے مدعا کے حصول کے لئے ازبس ضروری ہے۔ ایران کی آزادی کو مٹا کر اور خلیج فارس تک پہنچ کر مشرقی تجارت کا پرانا پر رونق بازار اگر ممکن ہو تو براہ شام گرم کیا جائے۔ اور بالآخر ہندوستان کا رخ کیا جائے جو ساری دنیا کی تجارت کی منڈی ہے۔ اگر ایک دفعہ ہم ہندوستان پہنچ گئے۔ تو پھر ہم انگریزی اشرفیوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

جہاں کشائی کا یہ پُر شکوہ منصوبہ جس وقت معرضِ قلم کیا گیا۔ اسلام ایسا ضعیف نہ ہوا تھا کہ پیٹر کے قصر تمنا کو الفنسچر کے ہوائی قلعہ سے بڑھ کر وقعت دے سکے۔ دولت عثمانیہ اپنی کمزوری کے باوجود ابھی تک اس قابل تھی۔ کہ پیٹر اور اس کی فوجوں کو دریائے پرتھ کے کنارے چاروں طرف سے گھیر کر اپنی شمشیر خون آشام اس کے سر پر لٹکا دے۔ اور اگر زارینہ کیتھرائن کی گریہ وزاری عثمانی وزیر اعظم کی احمقانہ نرم دلی سے اپنے خاوند اور اس کے لشکر کی جان بخشی نہ کرالیتی تو پیٹر کی آرزوؤں کا ہمیشہ کے لئے خون ہو چکا تھا۔ افق ایران پر نادر شاہ کے نیّر اقبال نے طلوع ہو کر ایشیا کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ اور اس "زادۂ شمشیر" نے جسے یورپ مشرق کا نپولین کہتا ہے وہ تمام صوبے جو پیٹر نے ایران سے چھینے تھے بزور بازو واپس لے لئے تھے۔ لیکن افسوس کہ اس کی فتوحات کا رخ شمال کی طرف قائم رہنے کی بجائے مغرب اور مشرق کی طرف ہو گیا۔ اور شمال کی صلیبی طاقت سے متصادم ہونے کی جگہ ترکی اور ہندوستان کی اسلامی طاقتوں سے ٹکرا کر اس نے اسلامی تاریخ کے ان المناک حوادث میں ایک اور حادثہ کا اضافہ کر دیا۔ جو ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کو اپنے زوال کا ذریعہ بنایا ہے۔

مسلمانوں کی برادر کشانہ باہم آویزی

تیمور سمرقند سے اٹھا اور آدھے ایشیا کو خاک و خون میں ملاتا ہوا بایزید یلدرم کی شاندار سلطنت کے پارہ پارہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جس کی ہیبت سے یورپ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے ساری مسیحی دنیا کے پرزے اڑا سکتا تھا۔ سلطان سلیم کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے جدامجد محمد فاتح کی آخری مجوزہ مہم کا علمبردار بن کر ایک ہی ترکتاز میں روما کی ہفتگانہ بلندیوں پر ہلال عثمانی نصب کر دیتا۔ لیکن اس نے اس کے بجائے مصر کی آزاد مملوکی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ یا ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوجی قوت کو توڑا۔ نادر نے بھی اپنی تلوار کی تیزی کا امتحان پیٹر کے جانشینوں کی گردنوں پر کرنے کے عوض یا تو اسے ترکوں پر آزمایا اور یا اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا خون بہایا

جنوبی ہندوستانی ترکش کے "خدنگ آخریں" اورنگ زیب اعظم کی رحلت محمد شاہ رنگیلے جیسے نااہل فرمانرواؤں کے سپرد کر دی گئی تھی۔

سو سال بعد محمد علی خدیو مصر کے روز افزوں اقتدار کی سیفی بھی الٹی ہی چلی۔ افریقہ کا عظیم الشان براعظم جسے آگے چل کر یورپ کی مسیحی دولتوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ اس کی کشور کشایانہ سرگرمیوں کی ایک وسیع جولانگاہ بننے کے لئے موجود تھا۔ لیکن اس کی ساری قوت دولت عثمانیہ کے خونچکاں جسم کی بوٹیاں نوچنے ہی میں صرف ہو گئی۔ یہاں تک کہ سلطان محمود مصلح کو اپنے اس باغی نائب السلطنت کی گزند سے بچنے کے لئے اپنے پشتینی دشمن نکولس اول زار روس کی پیش نمودہ امداد بادل ناخواستہ قبول کرنی پڑی۔

اس تمام برادر کشانہ باہم آویزی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا تھا کہ روس کی طاقت روز بروز بڑھتی جائے اور پیٹر نے جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر کی ساعت قریب تر آتی جائے۔ ان تمام آزاد تاتاری حکومتوں کو جن کا سلسلہ کوہ الطائی کے دامن سے لے کر دشت قبچاق اور کریمیا تک پھیلا ہوا تھا مسخر کرنے کے بعد جانشینان پیٹر اپنے روائتی نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ خلیج فارس کی طرف پیش قدمی کرنے میں مصروف تھے اور ساری دنیا کی تجارتی منڈی پر بھی ایک نہ ایک دن ان کا قبضہ ہو کر رہنا تھا۔ لیکن اس منڈی پر انگلستان کے خوش نصیب بنئے پہلے ہی قابض ہو چکے تھے۔

اسلامی خطرہ کا کابوس

ہندوستان کی تسخیر کے صد سالہ تدریجی دوران میں جس کا نقطہ آغاز معرکہ پلاسی (۱۷۵۷ء) ہے انگریزوں نے کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ ہندو محکومانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ خطرہ جب کبھی ہوگا اسلام کی طرف سے ہوگا جس کا ترکہ وہ چھین رہے ہیں۔ اس خطرہ کے سدباب کی ان کے نزدیک یہی ایک شکل تھی۔ کہ مسلمانوں کی مادی طاقت حرف غلط کی طرح مٹا کر ان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی استعداد کو رفتہ رفتہ مغربیت کے سانچے میں ایسا ڈھالا جائے کہ وہ قانون اسلام سے

مطلقاً بیگانہ ہو جائیں اور آفات فرنگ کی غلامی کے خوگر ہو کر اپنے آباو اجداد کی روایات کو بالکل بھول جائیں۔ شاہ عالم سے ۱۷۶۵ء میں بہار، بنگال اور اڑیسہ کی سند دیوانی حاصل کرتے ہی انگریزوں نے اس حکمت عملی کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ شاہ عالم نے یہ حاکمانہ منصب انہیں اس شرط کے ساتھ تفویض کیا تھا کہ حکومت کے نظم و نسق میں وہ شریعت اسلامی کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک اس شرط پر عمل درآمد بھی رہا ہے۔ انگریزی عدالتوں میں مفتی، قاضی اور صدر الصدور اسلامی احکام کے نفاذ سے مسلمانوں کی اشک شوئی کرتے رہے۔ لیکن چند ہی سال میں یہ نقشہ بدل گیا۔ شاہ عالم کی سند ایک پرزہ کاغذ ہو کر رہ گئی اور وہ اسلامی قوانین جو اس سند کے رو سے وضع کئے گئے تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ کی عنایت سے ایسے گاؤ خورد ہوئے کہ موجودہ نسل کے مسلمانوں کو ان کا علم تک نہیں

سلطان ٹیپو شہید اور واجد علی شاہ

اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر جنوبی ہند میں اسلامی اقتدار کے آخری نشان بردار سلطان ٹیپو رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت اس خونچکاں مرثیہ کی سرخی بن گئی۔ جو پچاس سال بعد لکھنؤ اور دہلی کی مجالس عزا میں شور نشور برپا کرنے والا تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۱۸ء میں غازی الدین حیدر کو اودھ کی "جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز" سرزمین کا بادشاہ تسلیم کر کے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جس پر وہ دل ہی دل میں پشیماں ہو رہے تھے۔ دہلی کو اجاڑ کر مسلمانوں نے لکھنؤ میں اپنی تہذیب کا ایک نیا مرکز قائم کر لیا تھا۔ حالانکہ برطانیہ کے مادی و معنوی مصالح ہرگز اس امر کے متقضی نہ تھے۔ کہ یہ مرکز قائم رہے۔ ۱۸۱۸ء کی لغزش کی تلافی کے لئے ۱۸۵۷ء میں جو شکل تجویز کی گئی۔ وہ صرف مغربی تہذیب کے نگارستان ہی میں نظر آسکتی ہے تمام دیرینہ عہود و مواثیق کو بالائے طاق رکھ کر اور ایمان و اخلاق و انصاف کے ہر ضابطہ کی مٹی پلید کر کے شاہ اودھ کو برضا و رغبت خود تخت و تاج سے دست بردار ہونے کی دعوت دی گئی۔ واجد علی شاہ کی خسروانہ تمکنت اس بھینس اور لاٹھی والی منطق کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور یہ وہ مشرقی جرم ہے۔ جسے مغربی تہذیب نے کبھی

معاف نہیں کیا۔ سارا اودھ جب انگریزوں کی اس کھلی ہوئی بدعہدی سے بھڑک اٹھا تو انگریزی تلوار جس کی عریانی کسی ایسی ہی صید کی منتظر تھی۔ تڑپ کر میدان سے باہر نکل آئی واجد علی شاہ تخت سے جبراً اتار کر مٹیا برج میں قید کر دیئے گئے۔ اور ان کی برگشتہ بخت رعایا کی تمنائے آزادی خون کی موجوں میں ڈبو دی گئی۔

واقعہ ۱۸۵۷ء

برس ہی بھر بعد جس خوفناک ہنگامہ نے کچھ دیر کے لئے انگریزی اقتدار کے سربفلک قصر میں زلزلہ ڈال دیا۔ وہ ارباب بصیرت کے نزدیک ان مظالم کا لازمی نتیجہ تھا۔ جو اہل اودھ پر روا رکھے گئے تھے۔ واقعہ ۱۸۵۷ء کو انگریزی مورخ "غدر" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ یورپ میں اگر ایسا ہی کوئی واقعہ رونما ہوتا تو "انقلاب" کہلاتا یا جذبۂ حب وطن کا ایک کرشمہ قرار دیا جاتا۔ بہرحال بدیسیوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی یہ آخری کوشش تھی۔ جو انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی طرف سے عمل میں آئی۔ لیکن ان کے گناہوں کی فہرست اس قدر طویل تھی کہ ایک غیر معین عرصہ کے لئے اغیار کی حلقہ بگوشی ہی اس کا کفارہ ہو سکتی تھی۔ اس طرح معصیت کو اپنا حلیف بنا کر انگریزوں نے ظلم بالجبر کر لیا۔ کہ اب کی مرتبہ مسلمانوں کو ایسا خوفناک سبق دیں گے اور ان کے جذبۂ حریت کو اس طرح کچلیں گے کہ پھر انہیں سر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہو۔ اب دریائے خون و آتش سے ایک موج گرنگون اٹھی۔ اور مسلمانوں کے سیزدہ صد سالہ دولت و اقبال کی لٹی ہوئی پونجی کے بچے کھچے اجزا کو بھی بہا لے گئی۔ قتل و نہب اور دار و گیر کا بازار ہر طرف گرم ہو گیا۔ جو سامنے آیا گولی سے اڑا دیا گیا۔ جو ہتھے چڑھا سولی پر لٹکا دیا گیا۔ ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے۔ ہزاروں گھر بے چراغ ہو گئے۔ جائدادیں لوٹ لی گئیں۔ عزتیں برباد کر دی گئیں۔ اور واجد علی شاہ کی طرح جو کلکتہ میں مقید تھے۔ ابو ظفر بہادر شاہ رنگون میں جلاوطن کر دیئے گئے جہاں دولت مغلیہ کی یہ آخری ٹمٹماتی شمع بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ بلات کی رات میں ملک کا سارا نقشہ ہی بدل گیا۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۱۸۵۷ء سے ہندوستان میں انگریزوں کی مطلق العنان اور غیر ذمہ دار حکومت کا اصلی دور شروع ہوتا ہے۔ ساری مخالف طاقتیں یا تو نیست و نابود ہو چکی تھیں۔ یا غلامانہ اطاعت پر مجبور کی جا چکی تھیں۔ امن و امان کے قیام اور برکاتِ تہذیب کی اشاعت میں خلل انداز ہونے کا حوصلہ کسی سر پھرے کو باقی نہ رہا تھا۔ پرانی روایات جن کا امتحان مسجدوں اور خانقاہوں اور مدرسوں میں ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مٹتی جاتی تھیں اور ان کی جگہ نئی روایات یونیورسٹیوں اور عدالتوں اور کونسلوں کے آغوش میں پرورش پا رہی تھیں۔ قال اللہ اور قال الرسول کہنے والے خال خال نظر آنے لگے۔ البتہ میکالے اور مل کا وظیفہ پڑھنے والوں کی بہتات ہو گئی۔ جن کی کتابِ حیات کا خلاصہ صرف اس قدر تھا۔

"بی۔ اے ہوئے ڈپٹی بنے پنشن ملی اور مر گئے"

قرآن کریم کی حریت آموز تعلیم

قرآن کریم کی حریت آموز تعلیم سے یورپ ہمیشہ لرزہ براندام رہا ہے۔ گلیڈسٹن نے لگی لپٹی رکھے بغیر ایک موقعہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک اس ملعون کتاب کا وجود ہے دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ (علیٰ قائلہ لعنۃ اللّٰہ والملٰئکۃ والناس اجمعین) لیکن پچاس سال کے اندر اندر اس کتاب مقدس کے بالالتزام تلاوت کرنے والوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب ۱۹۱۱ء میں بہ تقریب جشنِ تاجپوشی شاہ جارج پنجم وارد دہلی ہوئے اور باتباع رسم سلاطین مغلیہ لال قلعہ کے جھروکے سے ان کے درشن کا اہتمام کیا گیا۔ تو کچھ مولوی اور صوفی اور مشائخ جو لارڈ کرزن کے ایسے کورنش بجالانے والوں کے گروہ کثیر الافغا

میں شامل ہو کر اپنی دینی بے حمیتی کا نظارہ جمنا کے ساحل کو دکھا رہے تھے اور عصر کا وقت آ جانے پر "حافظوا علی الصلوٰۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ" کی لفظی پابندی کرنے میں مصروف تھے۔ کسی کے یہ کہتے ہی کہ بادشاہ سلامت برآمد ہو گئے "ایسی سٹی بھولے کہ قوموا اللّٰہ قانتین" کا مفہوم بھی ذہن سے جاتا رہا اور یہ بدحواسی کے عالم میں نیتیں توڑ توڑ کر بھاگے۔ اور جب یہ معلوم ہوا۔ کہ بادشاہ کے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے تو خفیف ہو کر پھر نماز پڑھنے لگ گئے۔

جارج پنجم تو پھر بھی بادشاہ تھے۔ اور آیۂ اولی الامر منکم کے نئے مفسروں کی رائے میں ظل اللّٰہ فی الارض کا ادب اس قسم کی تعظیمی حواس باختگی کے استحباب کی سند تھا۔ لیکن ایک معمولی انگریز کی صورت بھی دیکھ کر نئی روشنی والے یہی سمجھنے لگے تھے کہ گویا عرش اعظم سے خدا اتر آیا۔ اسی جشن تاجپوشی کی تقریب پر جب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا نذیر احمد اسلامیات پر تقریر کر رہے تھے تو دفعتہً صدا بلند ہوئی کہ لارڈ کچنر آ گئے۔ یہ سننا تھا کہ جلسہ میں ایک کھلبلی سی پڑ گئی۔ کانفرنس کے کارپردازوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور سب کے سب فاضل خطیب کو اپنا خطبہ آپ ہی سننے کے لئے چھوڑ کر ہانپتے کانپتے لارڈ کچنر کے قدموں تک جا پہنچے۔ یہ حالت دیکھ کر مولانائے مغفور سے نہ رہا گیا اور انہوں نے جل کر کہا کہ کچنر ہی آیا ہے کچھ قیامت تو نہیں آئی۔ جو ان لوگوں کے دل یوں ساقط ہوئے جاتے ہیں۔ اسی وضع وقماش کے بزرگواروں کی روش سے متاثر ہو کر اکبر مرحوم نے کہا تھا۔

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

سرحد شمالی و مغربی

اس قسم کا ذہنی ماحول پیدا کر لینے کے بعد انگریز ہندوستان کے داخلی امن کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ خطہ جنت نشان اب قیامت تک

بھی ان کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ البتہ شمالی ومغربی سرحد کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا جو پیٹر کی وصیت پر عمل کرنے والوں کے اقدام کی زد میں تھی۔ روسی خطرہ کا کابوس بیسویں صدی کے شروع تک رہ رہ کر انگریزوں کے سینہ پر سوار ہوتا رہا اور وہ نصف صدی تک اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے کہ اس مہیب شمالی طاقت کی پیش قدمی سے ہندوستان کو کس طرح محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

افغانستان اور برطانیہ

اوّل اوّل انگریزوں کا خیال تھا کہ افغانستان کا فوجی قبضہ اس معمے کے حل کی بہترین شکل ہے امیر دوست محمد خان کا بجز اس کے اور کوئی قصور نہ تھا کہ ان کے تعلقات روس کے ساتھ دوستانہ تھے۔ انہی تعلقات کو تسخیر افغانستان کی وجہ جواز قرار دے کر انگریزوں نے ۱۸۳۸ء میں امیر موصوف کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی امداد سے جس کا صلہ آگے چل کر ان کی اولاد کو الحاق پنجاب کی شکل میں ملا۔ ایک کامیاب حملہ کے بعد کابل پر قبضہ کر لیا گیا۔ جہاں انگریزی فوج نے یہ سمجھ کر کہ یہ ملک بھی اب ہمیشہ کے لئے ہمارا ہو چکا مستقل چھاؤنیاں ڈال دیں۔ لیکن جنگ جو اور حریت پسند افغانوں کی فطرت سے آشنا ہونے کے لئے برطانیہ کے مدبرین کو متعدد تلخ تجربوں کی ضرورت تھی۔ کابل کے فوجی قبضہ کو پورے تین سال بھی نہ گزرے تھے کہ افغان آبادی شمشیر بکف ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور انگریزی فوج کو چاروں طرف سے گھیر کر تلوار کی باڑھ کے آگے رکھ لیا۔ اتنے بڑے لشکر جرار میں سے صرف ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن اس واقعہ ہائلہ کی خبر اپنی قوم کو پہنچانے کے لئے زندہ رہ کر بحال تباہ جلال آباد پہنچا۔

اس خوفناک تباہی کا انتقام لینے کی غرض سے انگریزوں نے پھر کابل پر چڑھائی کی اور اگرچہ افغانی افواج کو شکست دے کر اور قندھار سے کر خیبر تک سارے علاقہ میں آگ لگا کر انہوں نے اپنے حریفوں سے بدلہ تو لے لیا۔ لیکن پنجاب کی طرح افغانستان ہندوستان کا ایک صوبہ پھر بھی نہ بن سکا۔ چالیس سال تک انگریز اپنی ساری طاقت

افغانوں کے زیر کرنے میں صرف کر کے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس غیور و جسور قوم کا مطیع و منقاد بنانا ایک امر محال ہے۔ان کے پاس اب صرف ایک حربہ باقی رہ گیا تھا۔جو بہت کم بے خطا ثابت ہوا ہے۔ جو کام تلوار سے نہ نکل سکا تھا وہ انہوں نے روپیہ سے نکالنا چاہا۔اور ان کی بڑی سے بڑی آرزو اب فقط اس قدر رہ گئی کہ فرمانروائے افغانستان ان کا وظیفہ قبول کر کے روس کے ساتھ اپنے تمام تعلقات منقطع کر لے۔اور کابل میں ایک انگریزی سفیر کے قیام مستقل پر رضامند ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھی انہیں خون کی کئی ندیاں عبور کرنی پڑیں۔ ۱۸۷۷ء میں جب انگریزوں نے کابل میں انگریزی سفارت خانہ کے قیام کی تجویز پیش کی تو امیر نے اسے بحقارت رد کر دیتے ہوئے کچھ دنوں بعد روس کی سفارت کا خیر مقدم ایسے تپاک سے کیا کہ سارا برطانوی رعب و وقار خاک میں مل گیا۔اور اس رعب کی بحالی کے لئے جب سر نیول چیمبرلین کا وفد عازم کابل ہوا تو خیبر کی سرحد پر اسے ایسا ذلیل اور رسوا کیا گیا کہ انگریزی حکومت کو بجز فوج کشی کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ انگریزی فوج فاتحانہ حیثیت سے پھر کابل میں داخل ہوئی اور نئے امیر یعقوب خاں کے ساتھ بتاریخ ۲۶ مئی ۱۸۷۹ء صلح کا ایک معاہدہ کیا گیا جس کے رو سے پایہ تخت افغانستان میں ایک انگریزی سفارت خانہ کا قائم رہنا لازم قرار دیا گیا۔ اس معاہدہ کو جو بنوک شمشیر سپرد قرطاس کیا گیا تھا بمشکل تین مہینے گزرنے پائے تھے کہ باحمیت افغانوں کا جذبہ آزادی اپنے دیرینہ جوش کے ساتھ پھر مشتعل ہوا۔ اور انگریزی سفیر سر لوئیس کیوگناری اپنے سارے عملہ سمیت قتل کر دیا گیا۔

امیر عبدالرحمن خان خلد آشیاں

آخر ۱۸۸۰ء میں ایک آزاد و خود دار قوم کی عقیدت کے ہاتھ نے تاج خسروی عبدالرحمن خاں جیسے عالی دماغ امیر کے سر پر رکھا اور افغانستان کو امن و امان کا ایک طویل دور نصیب ہوا۔ انگریزوں کی اس خواہش کو تو امیر عبدالرحمن خاں نے بھی پورا نہ کیا کہ دربار کابل میں ایک برطانوی نژاد سفیر موجود رہے۔ بڑی مشکلوں سے ہندی مسلمان سفیر کے قیام کی اجازت دی

گئی۔ کہ اس کی حیثیت بھی ایک سیاسی نظر بند کے درجے سے بڑھنے نہ پائی۔ البتہ یہ اصول تسلیم کر لیا کہ ایک بیش قرار سالانہ وظیفہ لے کر اور بوقت ضرورت جنگی امداد کا متوقع رہ کر معاملات خارجہ میں افغانستان اپنی خود مختارانہ حیثیت کو برطانیہ کی مرضی کے تابع رکھے گا۔ انگریزوں اور افغانوں کے تعلقات اب کسی قدر خوشگوار ہو چلے۔ لیکن بیدار مغز امیر اپنے انگریزی حلیفوں کو مدبرانہ طریق پر ہمیشہ متنبہ کر دیا کرتا تھا۔ کہ اگر انہوں نے کسی قسم کی بے رخی برتی یا افغانستان کے اندرونی معاملات میں کسی طرح مداخلت کی تو ایک اور ہمسایہ طاقت اس کی امداد کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ راولپنڈی کے دربار سے رخصت ہونے وقت امیر خلد آشیاں نے نائب السلطنت کشور ہند کو روسی ساخت کا جو جوتا تحفے کے طور پر دیا تھا۔ وہ اس وضع کے لطیف اشارات میں اپنا جواب آپ تھا۔ چالیس سال بعد ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد اسی نعلین کی پے بہ پے ضربوں کا تماشا دیکھنے والی تھی۔

امیر عبدالرحمٰن خاں جنہوں نے کافرستان کی نواحی ولایت کی تسخیر سے ثابت کر دیا کہ اسلام کا بازوئے کشور کشا ابھی تک شل نہیں ہوا۔ اپنی سلطنت کے داخلی نظام میں مغربی اثرات کے نفوذ کی ہمیشہ بڑی سختی سے روک تھام کرتے رہے۔ یورپ کی اکال الامم تہذیب کو انہوں نے اپنی آنکھوں سطوت کسرائی کی بنیادیں کھوکھلی کرتے دیکھا تھا اور وہ نہ چاہتے تھے کہ قبائے اسلام ان کے پایۂ تخت پر بھی اپنے جادو کے ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہو جائے اس بارے میں ان کی احتیاط یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ جب راقم الحروف کے والد مغفور نے اجرائے سررشتۂ ڈاک و تار کی تجویز کے ضمن میں اپنا دیرینہ تجربہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ تو امیر خلد آشیاں نے خود اپنے قلم سے یہ جواب لکھ بھیجا۔ کہ اس تحریک کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن چنداں یہ قبل از وقت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ فتنے از سر نو بیدار ہو جائیں۔ جن کی سرکوبی میں میری ساری طاقت صرف ہو چکی ہے۔

حضرات بوادر کا مقدس طبقہ ایشیا میں ہمیشہ سے مغربی ملوکیت کا مقدمۃ الجیش بنتا چلا آیا ہے۔ افغانستان کی تاریک خیال آبادی میں انجیل مقدس کا نور پھیلانے کے لئے یہ بزرگوار بے تاب تھے۔ امیر خلد آشیاں نے ان کی بیتابی کو اس بلیغ جواب سے رفع کر دیا۔ کہ پہلے

آپ خود اپنے گھر کی فکر کیجئے جسے اس روشنی کی بہت بڑی حاجت ہے۔

علی گڑھ کی تحریک کہ جس کی ابتدائی زندگی محض انگریزوں کی نظر عنایت پر موقوف تھی اپنے نشو و نما کے لئے آئے دن جہاد کے استخفاف پر طبع آزمائی کرتی پڑتی تھی اور سورۂ توبہ کے احکام کی اس مصلحت آمیز منقصت کی لے قادیان سے تو یہاں تک بڑھ جاتی تھی کہ قتال فی سبیل اللہ کو اگلے زمانے والوں کی دفع الوقتی کا ایک عارضی حیلہ قرار دے کر موجودہ دور میں اس کے وجوب سے قطعاً انکار کر دیا گیا تھا۔ آج بھی قادیان والوں کو ہم علے الاعلان کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ محمد مصطفےٰ کی دو شانیں ہیں۔ جلالی اور جمالی "تلوار کا دور جو مظہر شانِ جلالی ہے ان کے ساتھ اور صحابہ و تابعین کے ساتھ بیت چکا۔ جنہیں دنیا سے مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرانے کے لئے تیغ آزمائی کی ضرورت تھی۔ اب شانِ جمالی کے ظہور کا زمانہ ہے اور مسلمانوں کے لئے راہ خدا میں شمشیر بکف ہونا گناہ ہے اس لئے کہ فرنگی تہذیب نے ضمیر انسانی کو آزاد قرار دے کر ضرورت جہاد بالسیف کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس قسم کا ناپاک سوفسطائی دجل جب اٹک کی موجوں میں تیر کر سرحد پار پہنچا تو جلال مصطفوی اس کا سر قلم کرنے کے لئے موجود تھا۔ اور جب مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت نے جو یونین جیک کی سایہ پرور دہ تھی۔ اس پر احتجاج کیا۔ تو عبدالرحمٰن خاں نے صرف اس قدر کہا کہ این جا بیا۔"

یہی وہ روایات تھیں جن کی گرد میں افغانستان کی آنے والی خود مختاری پل رہی تھی۔ اور غیر مہذب پٹھانوں کی یہی وہ ادائیں تھیں۔ جنہوں نے مغربی تہذیب کے پرستاروں کو "وظیفہ خوار" برطانیہ کے پوتے کی طہارت کے لئے کوزہ و کلوخ کی فراہمی کا سبق سکھا دیا

"ذرا دیکھو تو افغانی مسلمانی کے کھیلوں کو
کلکٹر ڈھونڈتے پھرتے ہیں استنجے کے ڈھیلوں کو"

روس، جاپان اور ٹرکی

روس کی جنوبی چال کے توڑ کے لئے شاطر برطانیہ کی بساط پر دو اور زبردست مہرے بھی موجود تھے۔ دولت عثمانیہ کے علاوہ جس نے یورپ کے ایک حقیقت شناس

اور بالغ نظر طبقہ کی رائے میں مغربی و جنوبی یورپ کو سلافی النسل اقوام کے وحشیانہ دستبرد سے چھ سو سال تک محفوظ رکھ کر مغربی تمدن کے نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا ہے مشرق الاقصیٰ کی نئی طاقت جاپان کے ساتھ بھی روس کو رقیبانہ چشمک پیدا ہو گئی تھی۔ افغانستان کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہو کر مدبرین برطانیہ اس رقابت سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہو گئے اور جاپان کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کر لئے۔ جنگ روس و جاپان جس نے منتہائے مشرق میں روس کے بری اور بحری اقتدار کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ انہی تعلقات کا نتیجہ تھی

اب روس کی حالت آدھے یورپ اور آدھے ایشیا کے مالک ہونے اور چودہ پندرہ کروڑ آبادی رکھنے کے باوجود اس مظلوم ریچھ کی سی ہو گئی۔ جو کسی چڑیا گھر کے آہنی سلاخوں والے پنجرے کے اندر بند ہو۔ بحر الکاہل کا ناکہ جاپان نے بند کر رکھا تھا۔ شمالی سمندروں کی راہ یخ بستہ موجوں نے روک رکھی تھی۔ بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کے پھاٹکوں پر ترکوں کا پہرہ تھا۔ خلیج فارس کے ساحلوں پر انگریز مسلط تھے۔ اس بے پناہ محاصرہ کو توڑ کر کسی ایک طرف کو نکل جانے کے لئے اس نے پوری طاقت سے جدوجہد شروع کر دی اور وسط ایشیا میں اس کی سرگرمیاں پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئیں۔ لارڈ کرزن نے ہندوستان کی عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی خلیج فارس میں جو مشہور بحری مظاہرہ کیا۔ اس سے یہ کھلی ہوئی تہدید مقصود تھی۔ کہ اگر روس نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو برطانیہ فوراً اعلان جنگ کر دے گا۔

پٹ اور فاکس

روس کے ہندوستانی منصوبہ کو زک دینے میں دولت عثمانیہ انگریزوں کی قدرتی حلیف ہو سکتی تھی۔ لیکن اس اسلامی سلطنت کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات ابتدا ہی سے صلیبی تعصب، اقتصادی حرص اور یورپ کی پیچ در پیچ بین الاقوامی رقابتوں کا بازیچہ بنتے رہے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جب روس کی زارینہ کیتھرائن ثانی کریمیا فتح کرنے کے بعد قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ تو انگلستان روس کا مخالف

اور ٹرکی کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے کہ برطانی وزیراعظم مسٹر پٹ کی رائے میں قسطنطنیہ کے روسی قبضہ سے برطانیہ کے مشرقی اقتدار کو ایک مہلک صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل کے لبرلوں کی طرح اس زمانہ کے لبرل بھی ترکوں سے شدید بغض رکھتے تھے۔ ۱۷۹۱ء کے اجلاس پارلیمنٹ میں جب روس اور برطانیہ کی کشیدگی تعلقات پر بحث ہوئی۔ تو فاکس نے جو لبرل جماعت کا رہنما تھا۔ ترکوں کو وحشی اور غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر خوب ہی کوسا اور اسی جماعت کے ایک اور نمائندے وہٹ بریڈ نے یہاں تک کہہ دیا۔

"اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ ملکہ کیتھرائن سے جو جو منصوبے منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ حرف بحرف درست ہیں اور ملکہ قسطنطنیہ پر قابض ہو کر ترکوں کو ان کے تمام یورپی مقبوضات سے نکال بھی دے۔ تو کیا کوئی انصاف پسند آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس بدلی ہوئی صورت حالات سے بنی نوع انسان کو بہت بڑا فائدہ نہ پہنچے گا۔"

یہ بھی سچ ہے کہ فاکس اور اس کے ساتھیوں کے اس جوش و خروش نے قسطنطنیہ کی خاطر کیتھرائن سے لڑائی مول لینے کی تجویز کو انگلستان کے عوام میں غیر ہر دلعزیز بنا دیا۔ لیکن باایں ہمہ مسٹر پٹ کی روسی اور ترکی حکمت عملی میں فرق نہ آنے پایا۔ اور ۱۷۹۲ء میں اس کا باقاعدہ اعلان حسب ذیل الفاظ میں کر دیا گیا۔

انگلستان کی خارجہ حکمت عملی اس بنیادی اصول پر مبنی ہے کہ یورپ کی قوتوں کے توازن کو برقرار رکھا جائے۔ اور یہ توازن صحیح طور پر اسی حالت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ تابحد امکان یورپ کے مقبوضات میں اضافہ نہ ہونے دیا جائے۔

نپولین بونا پارٹ کی عظیم الشان فتوحات نے انگریزوں کو توازن کے اس اصول کی ترمیم پر مجبور کر دیا گیا۔ روسی خطرہ کی جگہ فرانسیسی خطرہ نے لے لی۔ اور انگریز جو روسیوں کے دشمن تھے۔ اب ان کے دوست بن گئے۔ اگرچہ اس دوستی نے ترکوں کو بہت کچھ نقصان پہنچایا۔ لیکن نپولین کی مشعل اقبال کے گل ہوتے ہی انگلستان و روس کی پرانی

رقابتیں پھر تازہ ہو گئیں۔ پٹ کی روایات کے احیاء کے لئے انگلستان میں ڈسرائیلی پیدا ہو گیا اور جب نکولس ثانی روس کے اس شوخ چشمانہ مطالبہ پر کہ سلطان عبد الحمید خان اپنی ایک کروڑ چالیس لاکھ مسیحی رعایا کی سرپرستی سے اس کے حق میں دستکش ہو جائیں سلطان نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ تو انگریزی اور فرانسیسی افواج کریمیا کے میدانوں میں ترکوں کے دوش بدوش روسیوں کو تہ تیغ کرتی ہوئی دیکھی گئیں۔

نہر سویز

لیکن یہ ۱۸۵۴ء کا واقعہ ہے۔ جب کہ انگریز مصر پر قابض نہ ہوئے تھے۔ جب کہ نہر سویز کی کھدائی شروع نہ ہوئی تھی جب انگلستان اور ہندوستان کے درمیانی سمندروں کو قطع کرنے کے لئے انگریزی جہازوں کو اس امید کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ اور جب کہ قسطنطنیہ دہلی کا مغربی پشتیبان تصور کیا جاتا تھا۔

نہر سویز کے احداث کے ساتھ ترکوں اور انگریزوں کے تعلقات کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ دوستی کا تذبذب اب ہمیشہ کے لئے دشمنی کی قطعیت کے ساتھ بدل جاتا ہے پٹ اور ڈسرائیلی کی جگہ گلیڈسٹن اور سالسبری نظر آنے لگتے ہیں اور یہ خیال بتدریج تبدیل ہونے لگتا ہے۔ کہ اگر قسطنطنیہ پر روسی قابض ہو گئے۔ تو ہندوستان کی عافیت معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ جنگ کریمیا میں اٹھائیس ہزار برطانی فوج کے اتلاف اور تین کروڑ پونڈ کے خرچ پر انگریز پشیمان ہونے لگتے ہیں۔ اور لارڈ ڈاربی جو اس پشیمانی کا حق ادا کرنے میں اپنے کسی ہموطن سے پیچھے نہیں ۱۸۷۷ء میں صاف کہہ دیتے ہیں کہ

"اگر روس باب عالی کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دے تو ملکہ معظمہ کی حکومت کے لئے محال ہوگا۔ کہ اس میں مداخلت کرے"

نہر سویز کے متعلق بھی انگریزی حکمت عملی اپنے قالبِ چپاپن کا جواب آپ ہے آج سے انگریز اپنی سلطنت کی شاہ رگ کہتے ہیں۔ جو اگر کٹ جائے۔ تو ان کا دم نکل جائے لیکن ۱۸۵۴ء میں جب اول اول فرانسیسی انجنیئر ڈی لیسپس نے اس کی کھدائی کا اجارہ مصر

کے ترکی نائب السلطنت محمد سعید سے حاصل کیا۔ تو انگریزوں کا کچھ اور ہی خیال تھا۔ ۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کو پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں لارڈ پامرسٹن نے مسئلہ احداث نہر سویز کے متعلق حسب ذیل اعلان کیا تھا۔

ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ یقیناً اپنے اس رسوخ کو جو اسے سلطان المعظم کے دربار میں حاصل ہے۔ اس غرض سے استعمال کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ سلطان تعمیر نہر کی اجازت صادر کر دیں۔ اس لئے کہ گذشتہ پندرہ سال سے ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ تمام اسی اثر اور رسوخ کو جو اسے قسطنطنیہ اور مصر میں حاصل ہے اجراء نہر کی تجویز کے خلاف صرف کرتی رہی ہے۔

لیکن جب ۱۸۶۹ء میں۔

انگریزوں کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود نہر تیار ہو کر جہاز رانی کے لئے کھل گئی تو انہوں نے معاً اپنی روش بدل دی اور نہر پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے مکاید و حیل کا جال بچھانا شروع کر دیا (سعد زاغلول پاشا کی یادداشت مرتبہ ۳ جنوری ۱۹۲۴ء جو مصری وفد کی طرف سے مجلس مصالحت لوزان میں پیش ہوئی)

مولائے عبدالعزیز سلطان مراکش اور محمد علی شاہ تاجدار ایران کی طرح جن کے عیش پسندانہ اسراف نے ان دونوں کا دیوالہ نکال کر سرمایہ داران فرنگ کی مداخلت کو آسان کر دیا۔ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی فضول خرچیوں نے بھی اسے کروڑوں کا مقروض بنا کر یورپی مہاجنوں کے پنجہ میں پھنسا رکھا تھا۔ خدیو کی اس مالی پریشانی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے نہر کے ۱۷۶۰۲ حصے جو خدیو کی خاص ملک تھے۔ کمتر قیمت کے بھاؤ خرید لئے اور نہر ان کی ہو گئی جو ۱۸۸۲ء میں مصر کے فوجی قبضہ کے بعد انہیں ترکوں کی دوستی کی ضرورت سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز کر دینے والی تھی۔ ڈاکٹر طہ ۱۸۷۶ء کی ترکی دوستی آدیزش پر نظر انتقاد ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اگرچہ نہر سویز کے آدھے حصے برطانیہ کی جیب میں داخل ہو چکے

تھے لیکن مصر میں انگریزی مورچے نہ جمے تھے۔ اور اس لئے قسطنطنیہ میں روسیوں کی موجودگی کو برطانیہ اپنی ہندوستانی سلطنت کے حق میں ابھی تک بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا (سلطنت عثمانیہ اور اس کے جانشین صفحہ ۲۷۸)

برطانیہ و روس کی مفاہمت

مصر کے قبضہ کے ساتھ ہی یہ خطرہ جاتا رہا۔ اور ایشیا میں برطانیہ اور روس کی صد سالہ رقابت کو کسی دیرپا مفاہمت سے ختم کر دینے کا وقت رفتہ رفتہ قریب آتا چلا گیا۔ مانچسٹر کے کارخانہ کفن سازی کے وہ کروڑ پتی حصہ دار جو ہندوستان کی بتیس کروڑ زندہ لاشوں کی سرپرستی کے سرمدی اجارہ دار ہیں۔ حلہ فروش بن کر شاہد روس کی محفل میں رسائی پانے کے لئے بے قرار تھا۔ اور انگلستان کی لبرل حکومت پر زور ڈال رہے تھے کہ روس کے ساتھ جس کا برطانیہ کی جنگی طاقت سے مرعوب ہونا محال ہے۔ کوئی مستقل سمجھوتہ کر لینا چاہیئے

اس مفاہمت کی اصولی اشکال کے واضع اول ہونے کا شرف موجودہ تاجدار برطانیہ کے والد بزرگوار ایڈورڈ ہفتم کو حاصل ہے جو اپنے سفیر آپ بن کر روال گئے اور نکولس زار روس سے تخلیہ میں مل کر روس اور برطانیہ کے ایشیائی مودت کو استوار کرنے آئے۔ اس تاریخی ملاقات کی تفصیل تو معلوم نہیں۔ لیکن ۱۹۰۷ء کا معاہدہ جس کی وقعات عالم آشکار ہیں اسی ملاقات کا فوری ثمرہ تھا۔

خلیج فارس والا بحری مظاہرہ جو برطانیہ کی طرف سے جانشینان پیٹر کی ہندوستانی تمناؤں کا آخری جواب تھا۔ اب بے ضرورت ہو کر نئی قسم کی دھمکیوں میں بدل جاتا ہے اور لارڈ کرزن علی روس الاشہاد پکارنے لگتے ہیں کہ وہ مدینہ کو ایک دن اپنا اصطبل بنا کر چھوڑیں گے۔

(راقم الحروف نے ۱۹۱۴ء میں زمانہ قیام لندن لارڈ کرزن کی اس ناپاک خرافات کے خلاف اخبار مانچسٹر گارڈین کی وساطت سے اپنی آواز بلند کی تھی) ایڈورڈ ہفتم کے جانشین

کے سفر ہندوستان کے لئے وزراء انگلستان کا سیاسی تفاؤل جہاز میں مدینہ ہی تجویز کرتا ہے جس پر خواجہ حسن نظامی جیسے صوفی عالی مقام تو یہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ کہ جارج پنجم کے مشرف باسلام ہونے کی غیبی بشارت ہے لیکن "رندانِ مست" کا ماتھا ٹھنکنے لگتا ہے کہ کہیں اس جہاز کے نام کے انتخاب میں برطانیہ کی خواہش تسخیر عرب کو تو دخل نہیں۔

۱۹۰۷ء کی انگریزی و روسی مفاہمت کے بعد جسے صحیح معنوں میں دنیائے مشرق کی موجودہ بیداری کا سب سے بڑا سبب قرار دیا جا سکتا۔ برطانیہ کی اسلامی حکمت عملی نے ایشیا میں اپنے لئے حسب ذیل اصول وضع کر لئے تھے۔

(۱) ایران کے شمالی حصہ پر روس کی سیادت تسلیم کر کے جنوبی ولایات پر خود قبضہ کر لیا جائے اور بیچ میں شرقاً و غرباً ایک مختصر سا علاقہ بطور حد فاصل چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ دونوں دولتوں کے اغراض متصادم نہ ہونے پائیں۔

(۲) افغانستان کو ہمیشہ کے لئے اپنا وظیفہ خوار بنا لیا جائے۔ تاکہ روس اور ہندوستان کے درمیان وہ بھی اسی قسم کی حد فاصل کا کام دے سکے۔

(۳) جب "مرد بیمار" کے ترکہ کی تقسیم کا وقت آئے جس کا آنا مغربی کارفرمایان قضاء قدر کے نزدیک موت کی طرح اٹل تھا۔ تو قسطنطنیہ روس کی میراث قرار پائے۔ تاکہ کھلے سمندروں تک پہنچنے کی وہ ناآسودہ خواہش جسے جاپان کی چیرہ دستی نے بحیرۂ اصغر میں غرق کر دیا تھا خلیج فارس کو اپنی جولانگاہ بنانے کے بجائے بحیرہ روم میں پوری ہو سکے۔ اور اس طرح پر جنوبی ایشیا میں برطانیہ کے بحری اور بری اقتدار کو کسی قسم کے گزند پہنچنے کا احتمال نہ رہے

(۴) اس "ساعت موعود" کو قریب تر لانے کے لئے بلقان اور عرب میں سازشوں اور فتنوں کا ایک جال پھیلا دیا جائے۔ تاکہ ترکوں کی فوجی قوت ایک طرف تو اپنی سلطنت کی اورپائی ولایات کی شورشیں مٹاتے مٹاتے کمزور ہو جائے اور دوسری طرف ہر وقت عرب سے ٹکراتی رہے۔ تا آنکہ حریفان فرنگ کے مقابلہ کی اس میں ذرا سکت نہ رہے۔

اگست ۱۹۱۴ء تک جو جنگ عظیم کی تاریخ ہے۔ برطانیہ نے اپنے دوست روس کے ساتھ مل کر اس چہارگانہ نصب العین کی تکمیل میں جس غیر متزلزل استقلال جس بے پناہ

عومیت اور جس بے دریغ اصول فروشی سے کام لیا۔ وہ اسی کی سیاسی روایات کا حصہ ہے ایران کا مدت ہائے دراز کے خواب جمود کے بعد یک بیک بیدار ہونا لیکن آنکھیں کھولتے ہی زندہ درگور کر دیا جانا ٹرکی کا ایک قطرہ خون گرائے بغیر ایک حیرت انگیز انقلاب کی منزلیں طے کرنا۔ مگر ہر ہر قدم پر بلیات و نوازل کے ایک نئے ہفتخوان سے دوچار ہونا۔ بوسینیا و ہرزیگوڈینا کا قبضہ، طرابلس کے معرکے۔ بلقان کی جنگ یورپ کے فتنے یہ سب کے سب انگریزوں اور روسیوں کی اسی دوستی کے گوناگوں کرشمے تھے۔

حریفان اسلام کی عافیت سوز جدید جد و جہد کی بے پایاں تفصیل ایک دفتر کی محتاج ہے۔ جس کے لئے یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ ایک چھوٹے سے واقعہ کا اندراج خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جس سے صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ مغربی طاقتیں جنہیں اپنی تہذیب و شائستگی پر اس قدر ناز ہے مشرقی ممالک پر مسلط ہو کر وہاں نہتی اور بے بس آبادیوں کو کیسے کیسے خوفناک مظالم کی آماجگاہ بناتی ہیں۔ اور پھر ان مظالم کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کیسی کیسی ابلیسانہ چالیں چلتی ہیں اس واقعہ کو سپرد قلم کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف بھی مدنظر ہے کہ وہی یورپی طاقت جو آرمینیا کے خیالی مظالم کی بھنک سنتے ہی غیظ و غضب میں آکر باسفورس پر اپنا جنگی بیڑا بھیج دیتی ہے ایسی حالت میں جب کہ اس کا کوئی حلیف اس کی آنکھوں کے سامنے کسی بیکس اسلامی آبادی کے خون سے ہاتھ رنگ رہا ہو۔ ٹس سے مس نہیں ہونے پاتی۔

روس کے مظالم پر برطانیہ کی خاموشی

مشہد مقدس پر روسیوں نے ۱۹۱۲ء میں گولے برسا کر اور کثیر التعداد مسلمانوں کا خون ناحق بہا کر ایران میں کہرام مچا دیا تھا۔ اور غصہ و غم کی ایک لہر دنیائے اسلام کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دوڑ گئی تھی۔ لیکن برطانیہ سے جو دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے آپ کو انسداد مظالم کے لئے منجانب اللہ مامور سمجھتا ہے۔ اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ اپنے حلیف کی اس وحشیانہ حرکت کے خلاف خفیف سی صدائے احتجاج ہی بلند کرے

اب کہیں دس سال کے بعد جب کہ ۱۹۰۷ء والے معاہدہ کو دیمک چاٹ چکی ہے۔ اور روس کا پرانا نظام حکومت تہ و بالا ہو چکا ہے۔ بریگیڈیر جنرل سر پرسی سائکس نے سوتے سے کروٹ لی ہے۔ اور برطانیہ کا مصیبطرانہ فرض اپنی کتاب "تاریخ ایران" میں اس طرح ادا کیا ہے۔

روس نے ایران میں جو خوفناک طرز عمل اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی بدترین مثال مشہد کی درگاہ کی بے حرمتی ہے۔ جسے بجا طور پر شیعی دنیا کی آنکھوں کا تارا کہا جا سکتا ہے۔ میں ان دنوں خراسان میں قونصل جنرل تھا۔ اور محمد علی شاہ سابق تاجدار ایران کی حمایت میں اپنے روسی شریک کار کی سرگرم سازشوں کو دیکھ سخت مشوش و متردد ہو رہا تھا۔ اس کی یہ خفیہ ریشہ دوانیاں آخر انتہا کو پہنچ گئیں۔ اور ایک مشہور مفسدہ پرداز یوسف ہراتی نے روسی قونصل خانہ کو ایک خطرناک مفسدانہ تحریک کا مرکز بنا دیا۔ اپنے مربی کے ایما سے یہ شخص درگاہ امام رضا میں پہنچ کر عوام الناس کا ایک انبوہ کثیر اپنے گرد جمع کر لیتا تھا اور اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے برافروختہ کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔ اس پر روسی قونصل جنرل نے اپنی حکومت کو یہ اطلاع دے کر کہ روسی رعایا کا مال و جان خطرہ میں ہے۔ روسی فوج کی ایک زبردست جمعیت اس خیالی خطرہ کے انسداد کے لئے طلب کر لی شرفا مشہد نے اپنی طرف سے سبھی جتن کئے۔ کہ کسی طرح روسیوں کو جنگی کاروائی کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ نہ آئے۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک کاری ضرب لگانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ خواہ اس کے لئے کوئی معقول وجہ موجود ہو یا نہ ہو ان کا پٹھو یوسف ٹیلی فون پر پل پل کی خبریں روسی قونصل خانہ کو پہنچا رہا تھا اور ساعت افزوں مجمع عام میں جو زیادہ تر باہر سے آئے ہوئے زائرین کے گروہ پر مشتمل تھا۔ برابر اپنی پر زہر کشانہ منطق کی چنگاریاں برسا رہا تھا آخر ایک دن روسیوں نے علی الصباح گولہ باری شروع کر دی اور درگاہ پر ہلہ بول

کر کثیر التعداد ناکردہ گناہ زائرین اور اہل شہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا زخمی کر دیا۔ اس حملہ میں یوسف اور اس کے ساتھیوں پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے پائی کیونکہ وہ توپ خانہ کی آتش باری سے پہلے ہی کھسک گئے تھے۔ رات کے وقت انہیں شہر کے ایک پھاٹک میں سے جس پر روسی کاسکوں کا پہرہ تھا بحفاظت تمام باہر پہنچا دیا۔ کچھ دن بعد یوسف کی ایک چٹھی میرے نام آئی۔ جس میں اپنی قیمتی خدمات کی تفصیل درج کرنے کے بعد اس نے تلخی کے لہجہ میں شکایت کی تھی کہ روسیوں نے ان خدمات کی پوری پوری قدر نہیں کی اور جو انعام اسے دیا گیا وہ توقع سے بہت ہی کم تھا۔ عجب نہیں کہ اس چٹھی کی خبر کسی نہ کسی طرح روسی قونصل کو لگ گئی بہرحال اس نے ایرانی احکام کو تعزیری کارروائی پر اکسا کر یوسف کو گرفتار کرا دیا۔ اور اس بدبخت کے کھڑے کھڑے گولی مار دی گئی۔ جس شخص نے اسے پکڑا تھا۔ اس کا جلوس مشہد کے بازاروں میں نکالا گیا۔ اور اس کی گاڑی پھولوں کی بارش سے لد گئی۔ یوسف کی نعش بھی نمائش کے لئے اس کے ہمراہ تھی۔ جس پر خلق خدا کی لعنتیں اور پھٹکاریں برستی جاتی تھیں۔ درگاہ امام رضا کی اس بے حرمتی کا سودا روس کو بہت مہنگا پڑا۔ اس لئے کہ ایرانیوں کو ان سے سخت نفرت ہو گئی۔ اور یہ نفرت برابر قائم رہے گی۔ ہم کو بھی ایرانی بہت برا سمجھنے لگ گئے۔ —— اس لئے کہ ہم اس کے دشمنوں کے حلیف تھے " (تاریخ ایران " مرتبہ سر پرسی سائکس و مطبوعہ یونیورسٹی پریس آکسفرڈ (۱۹۲۲ء) صفحات ۱۵۲ و ۱۵۳)

سر پرسی سائکس اپنی اس تحریر میں اہل ایران کی مصیبتوں کا ذمہ دار صرف روس کو قرار دیتے ہیں اور خود معصوم بنتے ہیں —— حالانکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ ایران کا گلا گھونٹنے کے لئے جو روسی خاص اہتمام سے تیار کی گئی تھی۔ اس کے بٹنے میں جو بیوسا زور نافذ کے ساتھ سر ایڈورڈ گرے بھی برابر کے شریک تھے۔ ہمارا یہ قول تو خیر ملا صاحب جیسے متحجر افتادہ پرستوں کے نزدیک شاید اسلامی تعصب کا جنون ٹھیرے۔ جس کا علاج صرف قید یا جرمانہ یا قرقی ہی ہو سکتا ہے لیکن وہ خود اپنے ہم قوم اور ہم وطن پروفیسر براؤن کے باب میں کیا کہیں گے۔ جو گورا رنگ بھی رکھتے ہیں اور تثلیث کے بھی قائل ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ۱۹۱۲ء کے واقعات کا حق تنقید اس طرح ادا کرتے ہیں۔

"ایرانیوں کی کچلی ہوئی روح اور خون شدہ تمناؤں اور ایران کی موجودہ ابتری و بدنظمی" کی ذمہ داری براہِ راست روس اور برطانیہ پر عاید ہوتی ہے اور اگر کوئی انتقام لینے والی طاقت حقیقت میں موجود ہے تو ایک نہ ایک دن ان دونوں کو رتی رتی کا حساب دے کر اپنے مظالم کا خمیازہ کھینچنا پڑے گا۔ ایران کی موجودہ صورتِ حالات کی اصلاح کی ہمارے ملک کے اس اہل الرائے طبقہ کو جو ایرانیوں کے ہمدرد ہونے کا مدعی ہے۔ بڑی فکر ہے۔ لیکن اصلاح کیا خاک ہو سکتی ہے جب نوبت یہاں تک پہنچا دی گئی ہو۔ کہ کابینہ وزارت پر جمود میں کی دہشت اور ہیبت سے ہر وقت لرزاں رہتا ہے۔ جمہور کو مطلق کوئی اعتماد نہیں خزانہ بالکل خالی ہے اور روس و انگلستان اول تو مالی امداد دینے ہی سے پہلو تہی کرتے ہیں اور اگر بطور قرض کوئی چھوٹی موٹی رقم دیتے بھی ہیں۔ تو سود الیا کس کر لگاتے ہیں کہ شائلاک یہودی کی روح بھی شرما جائے۔"

جب ۱۹۱۸ء میں مشہد کے شہیدوں کا خون رنگ لایا اور حضرت امام رضا کی درگاہ کی بے حرمتی کرنے والے خود حوالہ خاک و خون ہو کر اپنا تخت و تاج ایک نئی قوم کے لئے چھوڑ گئے جو سرمایہ داروں کے خون کی پیاسی اور برطانوی نظام جہانبانی کی دشمن جانستان تھی۔ تو انگریزوں کے مشرقی زاویہ نگاہ میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا۔ اس تغیر کے لئے حالات بھی بظاہر سازگار تھے۔ مشرقی افریقہ کی وسیع سرزمین جو کیپ کالونی اور مصر کے درمیان برطانوی مقبوضات کے جغرافیائی تسلسل کی سنگ راہ تھی۔ جرمنی سے چھینی جا چکی تھی۔ اور اس خالی ملوکیت پرست سیسل روڈز کی روح کو خوش کرنے کا وقت آ گیا تھا جس نے سب سے پہلے یہ دلفریب خواب دیکھا تھا کہ کیپ سے قاہرہ تک ریل کی ایک ایسی پٹری بچھائی جائے جو خالص انگریزی علاقہ میں سے گذرتی ہو مصریوں، عربوں اور ہندوستانیوں کی نیم مجبورانہ و نیم دین فروشانہ اعانت سے جرنیل ایلن بی کو اس قابل کر دیا تھا کہ ریگستان سینا کا سینہ ایک خط آہن سے چیر کر قاہرہ اور بیت المقدس کو آپس میں ملا دے۔ بغداد اور بصرے پر بھی انگریز قابض ہو چکے تھے۔ سارا فلسطین، سارا شام، سارا ایشیائے کوچک، سارا عراق اور سارا ایران انگریزوں کی گرفت میں تھا اور قسطنطنیہ کے قبضہ نے اس گرفت

کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ فرغانہ، خوارزم اور قفقاز بھی اثر و رسوخ برطانوی تدبیروں کی زد میں تھے پس کوئی وجہ نہ تھی کہ مسٹر لائڈ جارج کی گورنمنٹ اس فکر میں منہمک نہ ہو جاتی۔ بغداد ریلوے کو توسیع دے کر دزداب تک پہنچا دیں جو کوئٹہ سے کوئی دو سو میل جانب مغرب خاص ایرانی علاقہ میں ہندوستانی ریلوں کے سلسلہ کا آخری اسٹیشن ہے اور اس طرح پر ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم ہو جائے جو دو براعظموں پر محیط ہو اور جس کی جغرافیائی وحدت و اکتناز کا یہ عالم ہو کہ اگر کوئی انگریز کیپ ٹاؤن سے ٹکٹ لے کر ریل میں سوار ہو تو قاہرہ، بیت المقدس، بغداد اور کوئٹہ ہوتا ہوا چھ ہزار میل کا سفر مسلسل خشکی پر طے کرنے کے بعد کلکتہ میں اترے لیکن خداالیشن مصطفٰے کمال اور امان اللہ کو سمجھے جن کی متفقہ زور آزمائی سے تہذیب انسانی کی یہ رنگین کمندیں اس وقت ٹوٹ گئیں جب کہ لب بام دو چار ہاتھ ہی رہ گیا۔

بولشویکوں سے انگریزی قوت کا تصادم، انگریزوں اور افغانوں کی فیصلہ کن آویزش افغانستان، روس، ایران اور اناطولیہ کا اتحاد اربعہ، اس اتحاد کے دباؤ سے برطانیہ کا مجبورانہ تخلیہ ایران اور بالآخر ان تمام وسیع مشرقی منصوبوں کا جنہوں نے سالہا سال تک لائڈ جارج اور کرزن کی ہوس استعمار کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ صرف عرب کے ریگزاروں تک محدود رہ جانا کہ وہاں بھی فرانس کی رقابت خار پہلو بنی ہوئی ہے۔ یہ تمام واقعات بغایت دلچسپ اور بے حد عبرت آموز ہیں اور اگر ہمیں ان کے جزئیات پر عبور ہو تو ایک ہوش ربا داستان تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن دوران جنگ میں انگریزوں کی وسط ایشیائی اور ایرانی سرگرمیوں پر ایک ایسا تاریک پردہ پڑا ہوا ہے۔ جس کے اٹھانے کی توفیق ہم پابہ زنجیر اور پرشکستہ ہندوستانیوں کو نہیں بخشی گئی جو اپنی ہر بیرونی اطلاع کے لئے یا تو رپوٹر کی رنگ آمیزیوں کے رہین منت ہیں یا کسی یورپی مصنف کے قلم کی یک طرفہ بد اعتدال طرازیوں کے شرمندۂ احسان ہیں۔ جنگ کے جس محاذ اور سیاسیات کے جس شعبہ میں انگریزی حکمت عملی کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہو اس کے متعلق تو ان اطلاعات کا ذخیرہ اس قدر بے حساب و بے پایاں ہے کہ نظر انتخاب کو بے اختیار اپنی عاجزی و درماندگی کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جہاں اس حکمت عملی کو کوئی زک پہنچی ہو اس کی

اول تو ہم تک کوئی خبر ہی نہیں پہنچنے پاتی ہے اور اگر پہنچتی بھی ہے تو اس قدر مبہم و بے ربط اور
ایسی الٹی بے جوڑ ہوتی ہے کہ صرف جرح و تعدیل ہی سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

تین سال کی تاریخ تو دہرا سکتی نہیں جب ۱۹۱۷ء میں روسی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئیں اور جو
کام جرمن اور ترکی توپوں نے ادھورا چھوڑا تھا وہ المانی جاسوسوں کی عیارانہ نشر و تبلیغ نے
پورا کر دیا تو روس دفعۃً اپنے حلیفوں کا ساتھ چھوڑ کر جنگ سے دست کش ہو گیا۔ وہ
قومیں جنہیں تاجدارانِ روس کے استبداد نے سائبیریا کے برفستانوں یا پیٹروگراڈ اور ماسکو
کے زندانوں میں پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔ دنیا کو ایک نئے انقلاب کا تماشا دکھانے کے لئے اب
آزاد ہو گئیں۔ اس انقلاب کے علم بردار بولشویک کہلاتے ہیں۔ جس سے اشتراکی عقائد
کے روسی پیرووں کی اکثریت مراد ہے بولشویکوں کا وجود سرمایہ داری کی اس فرنگی لعنت کا
قدرتی جواب ہے جس کا طوق مغربیوں کی بڑھتی ہوئی ہوس زر اندوزی نے برقی اور دخانی
کلوں کی ایجاد کے زمانہ سے مشرقیوں کی گردن میں تو ڈال ہی رکھا ہے لیکن مسیحی دنیا کے
اس فلاکت زدہ طبقہ کی گردن بھی اس کی آہنی گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکی جو نان شبینہ
تک کے لئے سرمایہ داروں کے رحم و کرم کا محتاج ہے حزب العمال برطانیہ کے رکن رکین
مسٹر سڈنی ویب نے اس لعنت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

سرمایہ داری یا نظام سرمایہ داری یا بالفاظ صحیح تر سرمایہ دارانہ تہذیب
سے مراد صنعت و حرفت اور قانون و آئین کی منزل نشو و نما کا وہ مقام ہے
جہاں پہنچ کر کارکنوں کا جزو غالب اپنے آپ کو آلات جلب منفعت کی
ملکیت سے اس طرح محروم پاتا ہے کہ وہ محض مزدوروں کی حیثیت میں تبدیل ہو
جاتے ہیں۔ جن کا ذریعہ معاش سلامتی جان و مال اور آزادی ضمیر قوم کے
ایک شرذمۂ قلیل کی مرضی کے تابع نظر آتی ہے۔ یعنی ان کی زندگی اس مختصر
سی کار فرما جماعت ہی کو خوش رکھنے سے برقرار رہ سکتی ہے جو ساری قوم
کی اراضی اور کلوں اور استعداد عمل کی قانونی مالک ہونے کی حیثیت سے
اس پورے کارخانہ کا انتظام خود کرتی ہے اور اس انتظام سے اس کا مقصود

یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی جیبیں بھرے۔

"یہی دنیا کے سرمایہ داروں میں برطانیہ کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ دنیا کے کونے کونے اور چپے چپے سے پیسہ پیسہ پائی پائی کر کے چاندی اور سونے کے جو ڈھیر اس نے سمیٹے ہیں ان کا عشر عشیر بھی کسی اور ملک کو نصیب نہیں ہوا سیم و زر کے ان تودوں کی فراہمی میں انگریزوں کو جو راس المال اپنی گرہ سے لگانا پڑا اس کے منافع کا اندازہ پانچ فی صدی یا دس فی صدی سے نہیں بلکہ ہزارہا فی صدی سے کیا جاسکتا ہے (سرمایہ دارانہ تہذیب کا زوال صفحہ ۱)

منافع کی اس شرح کو جو آج تک گھٹنے میں نہیں آئی تا ابد قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ سلطنت کو ایک بہت بڑا تجارتی کارخانہ سمجھا جائے اس کارخانہ میں ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں مزدور دن رات خون پسینہ ایک کرتے نظر آئیں۔ ان کی ہڈیوں کے چونے سے انگریزی محل تیار ہوں ان کا خون محلوں کے نقش و نگار میں صرف ہو۔ پچیس سال بھی نہیں ہوئے کہ لبرل جماعت کے رہنما مسٹر جوزف چیمبرلین نے اپنی ایک ہنگامہ خیز تقریر میں یہ سبق اپنی قوم کو یوں دیا تھا۔

سلطنت کیا ہے؟ محض تجارت ہے؟ تجارت ہی نے اس کو پیدا کیا تجارت ہی پر اس کی بنیاد رکھی گئی اور نہ تجارت ہی اس کو زندہ رکھ سکتی ہے تجارت نہ ہو تو ایک دن بھی اس کا زندہ رہنا محال ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ ہمیں حکوم ہندوستان پر اپنی گرفت کو ابداً ڈھیلا نہ کرنا چاہئیے۔ ہندوستان ہمارا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قیمتی گاہک ہے اور ایسا گاہک نہ ہمیں آج تک اور کوئی ملا ہے نہ آئیندہ ملے گا اسی لئے میں حکومت کی اس روش پر صاد کرتا ہوں کہ مصر کا قبضہ کبھی نہ چھوڑا جائے اسی لئے میں نے موجودہ حکومت اور سابقہ حکومت پر زور دے کر زور ڈالا ہے کہ افریقہ کے اس وسیع براعظم میں جہاں تہذیب اور تجارت کے لئے نئی راہیں کھل رہی ہیں ہمیں اپنے حاکمانہ اقتدار و اثر کی توسیع کا کوئی واجبی

موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اور بالآخر اسی تجارتی تفوق کے برقرار رکھنے کی خاطر میری یہ پختہ رائے ہے کہ ہمارے جنگی بیڑے کی طاقت میں یوماً فیوماً اضافہ ہونا چاہیئے۔ تا آنکہ دنیا کے سمندروں میں ہماری دھاک ایسی بندھ جائے کہ ہمارے موجودہ مقبوضات سے یا ان ممالک سے جن پر آگے چل کر ہمارا قبضہ ہو۔ دنیا جہاں کی کوئی قوت ہمیں بے دخل نہ کر سکے (خطبات رائٹ آنریبل جوزف چیمبرلین، ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۰۱)

جہاں کشائی اور جہانبانی کا یہ تجارتی تصور جس کو مسٹر لائڈ جارج کی تخییل فلک الافلاک تک پہنچا رہی تھی بولشویکوں کے اشتراکی نصب العین کی ضد تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ

(۱) کسی قوم کو ان حدود سے جو زبان اور نسل اور عمرانی روایات کی بنا پر قدرت نے اس کے لئے تجویز کر رکھی ہیں آگے بڑھ کر کسی دوسری قوم پر بزور شمشیر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

(۲) جو حکومت ممالک غیر کی تسخیر اور ان ممالک کے باشندوں کی حلقہ بگوشی کو اپنی قوت کی بقا کا ذریعہ سمجھتی ہو وہ بنی نوع انسان کی دشمن ہے اور ایسا نظام حکومت جس قدر جلد مٹا دیا جائے اتنا ہی تہذیب انسانی کے حق میں اچھا ہے۔

(۳) ہر ملک کی اقتصادی دولت پر اس ملک کے باشندوں کا یکساں حق ہے اسی لئے شخصی ملکیت جس سے ترجیحی حقوق پیدا ہوتے ہیں مٹ جانی چاہیئے اور سلطنت کا نظم و نسق "سوویٹ" جماعت (جمہوری پنچائتوں) کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جو سارے ملک کی جائداد کا انتظام کریں اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے لائق سامان معیشت بہم پہنچا کر پس انداز شدہ منافع کو قومی امانت سمجھیں جو حسب ضرورت قوم کی فلاح و بہبود پر صرف ہو۔[۱]

[۱] اشتراکی فلسفہ کے اس تیسرے عقیدے کو مسلمان تسلیم نہیں کر سکتے اسلام نے جائیداد کی شخصی ملکیت کا احترام پوری طرح برقرار رکھا ہے اور افراد ملت کو فراہمی دولت

کا غیر محدود اختیار بخشتے وقت اس حقیقت کبریٰ کو نظر انداز نہیں کیا کہ جسمانی اور دماغی استعداد کے لحاظ سے قوائے انسانی غیر مساوی واقع ہوئے ہیں ایک چست و چالاک شخص جسے مبدء فیاض نے روشن دماغ یا مضبوط ہاتھ پاؤں عنایت کئے ہیں ایک جنم کے کند ذہن اور کاہل یا کمزور شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ دولت پیدا کر سکتا ہے اور اگر ان دونوں پر یکساں تقسیم کر دیا جائے تو یقیناً وہ جذبۂ عمل جس کی سب سے بڑی محرک خواہش جلب منفعت ہے معطل ہو جائے اور کسب کمال کی امنگ دلوں سے جاتی رہے لیکن اسلام کی نظر سے وہ خرابیاں بھی اوجھل نہ تھیں جو اس قسم کی غیر مشروط آزادی سے پیدا ہو جانی ناگزیر تھیں اور جن کا خمیازہ مسیحی دنیا آج اس بُری طرح کھینچ رہی ہے کہ ایک طرف اگر گنتی کے دو چار قارون ہیں جن کے خزانوں کی کنجیوں کا بوجھ موٹر لاریاں ہی سہار سکتی ہیں۔ تو دوسری طرف لاکھوں فاقہ مست غریب ایسے بھی ہیں جنہیں پیٹ کی دوزخ بھرنے کو ایک گروہ نان اور لب تر کرنے کو ایک کوزۂ آب بھی میسّر نہیں۔ اسلام نے پہلے ہی دن فریضۂ زکوٰۃ کے نفاذ سے ان سب خرابیوں کی جڑ کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا مسلمان از روئے مذہب مجبور ہیں کہ صاحب نصاب ہونے کی حالت میں اپنی خالص آمدنی کا چالیسواں حصّہ مساکین اور دوسرے واجب الامداد مستحقین کے لئے علیحدہ کر دیں باقی انتالیس حصّوں پر انہیں پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں خرچ کریں اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسلام نے ترکہ کا جو قانون وضع کیا ہے وہ بھی حقیقت میں تیز دند حن الحد سرمایہ داروں کی جڑ پر کاری ضرب ہے ایک شخص عمر بھر دولت کماتا رہتا ہے لیکن جب وہ مرتا ہے تو اس کی ساری دولت مختلف رشتہ داروں میں بٹ جاتی ہے اسلام حقیقت میں فطرت کے اعتدال کا نام ہے اس کا منتہا ہر چیز کی اچھائیاں قائم رکھنا اور اس کی برائیوں کا استیصال کر دینا ہے۔ کائنات انسانیت میں جذبۂ عمل کی سب سے بڑی محرک خواہش جلب منفعت ہے۔ اس لئے اسلام شخصی املاک کے احترام سے اس قوت محرکہ کا اہتمام کرتا ہے۔ لیکن دولت کا کسی ایک مقام پر یا چند مقامات پر جمع ہو جانا بنی نوع انسان کے لئے علی العموم نقصان رساں ہے اس لئے اس نے زکوٰۃ

اور ترکہ کے قوانین سے متجاوز عن الحد اجتماع دولت کا مناسب سد باب کر دیا ہے علاوہ بریں مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اور دنیائے توحید کی رائے عامہ نے ہمیشہ اس شخص کو سیرت اسلامی کا واجب التقلید نمونہ قرار دیا ہے جو اپنی کمائی پر اپنا حق صرف بقدر اپنی ضرورتوں کے سمجھتا ہے اور جو کچھ پس انداز ہو اسے راہ خدا میں لٹا دیتا ہو۔ اسی لئے مسلمان اپنی سیزدہ صد سالہ عمر میں سرمایہ اور محنت کی کشاکش حاضرہ سے بچے رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج تک دنیائے اسلام کو مفلسوں اور مالداروں کی اس خوفناک کشمکش سے سابقہ نہیں پڑا اور نہ آئندہ پڑنے کا احتمال ہے جس نے آخر کار بولشویکی شکل پکڑ کر مسیحی سرمایہ داروں کے گھروں میں کہرام مچا دیا۔

ظاہر ہے کہ ان انقلاب انگیز خیالات کی نشر و تبلیغ کے لئے بولشویک شروع ہی سے ہمہ تن وقف تھے اور جن کا اولین کرشمہ اسلامی ترکستان کی آزادی کا اعلان تھا۔ برطانیہ ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ ان کی سب سے زیادہ کاری ضرب سرمایہ داری کے برطانی نظام ہی پر پڑتی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں جب انگریز ترکوں کا تیا پانچا کرنے میں معروف تھے لینن نے حسب ذیل اعلان کے اجرا سے لائڈ جارج کی نیند حرام کر دی۔

اے دنیا کے مسلمانو جو سرمایہ داروں کے پنجہ میں اسیر ہو کب تک خواب غفلت میں پڑے رہو گے؟ جاگو کہ صبح سر پہ آگئی! اس ظالمانہ سلوک کی روایات کو جو زار تمہارے ساتھ روا رکھتا تھا۔ روس نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے اور اب وہ انگریزوں کے جور و استبداد کا جوا اپنے کاندھے سے اتار پھینکنے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہے روس تمہاری مذہبی آزادی اور حکومت خود اختیاری کا ضامن ہوگا جنگ سے پہلے کی ترکی سرحدات برقرار رکھی جائیں گی۔ ترکی علاقہ کی چپہ چپہ زمین بھی آرمینیا کو نہ دی جائے گی۔ دردانیال پر تم ہی قابض رہو گے اور قسطنطنیہ بدستور اسلامی دنیا کا پایۂ تخت رہے گا مسلمانان

روس اپنی قومی اسلامی حکومتیں قائم کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔اس کے معاوضہ میں ہم صرف اس قدر چاہتے ہیں کہ تم ان شوخ چشم سرمایہ داروں پر پل پڑو جو اس بات پر تلے بیٹھے ہیں کہ تمہارے ملک کی دولت لوٹ کر لے جائیں اور اسے اپنی نوآبادی بنالیں (جدید دنیائے اسلام" صفحہ ۲۸۸)

اسی طرح کا ایک اور اعلان روسی افواج کے اس جیش کے نام شائع کیا گیا۔ جو افغانستان اور ہندوستان کی سرحد پر متعین تعینات ہو۔ا۔

جیش پامیر کے رفیقو! تمہیں ایک ذمہ دارانہ خدمت سپرد کی گئی ہے ۔جمہوریۂ سویٹ نے تمہیں افغانستان اور ہندوستان کی دوستدار سرحدات پر پامیر کی فوجی چوکیوں کی حفاظت کے لئے بھیجا ہے۔ پامیر کی سطح مرتفع انقلاب پرور روس کو ہندوستان سے جدا کرتی ہے جس کے تیس کروڑ لینے والے مٹھی بھر انگریزوں کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس قلۂ رفیع پر جیش آزادی کا سرخ علم بلند ہونا چاہیئے۔ کاش اہل ہند کو جو اپنے جابر انگریز آقاؤں سے دست و گریباں ہیں جلد معلوم ہو جائے کہ دوستوں کی مدد کچھ زیادہ دور نہیں۔ تمہیں چاہیئے کہ شمالی ہند کے حریت پسند قبائل سے گھل مل جاؤ اپنی گفتار و کردار سے ان کے انقلابی حوصلے بڑھاؤ اور برطانی رئیسوں امیروں اور مہاجنوں کے گماشتوں نے سویٹ کے خلاف کذب و افترا کا جو طومار فراہم کر رکھا ہے۔ اس کی دھجیاں بکھیر کر فضائے مشرق میں اڑا دو۔ زندہ و پائندہ باد اتحاد و انقلابیان یورپ و ایشیا (جدید دنیائے اسلام" صفحہ ۲۸۹)

جس قوم نے صرف ایک ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے اپنے قبضہ میں رکھنے کی غرض سے کبھی افغانستان کا ٹینٹوا دبوچا ہو، کبھی ایران کا گلا گھونٹا ہو۔ کبھی ٹرکی کے پرزے اڑائے ہوں۔ کبھی عرب کو تہ و بالا کیا ہو کبھی مصر پر اپنی دھاک بٹھائی ہو، کبھی

جرمنی کی بنیادیں کھود پھینکی ہوں کبھی فرانس کو آنکھیں دکھائی ہوں۔ غرض محض اس ایک مقصد کی خاطر ہر کروفی وناکردنی گناہ سے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا ہو اس کے دل و دماغ پر ان اعلانات کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ اظہر من الشمس اور ابین من الامس ہے مسٹر لائڈ جارج نے ارادہ کر لیا کہ بولشویکیوں کا نام و نشان صفحۂ کائنات سے مٹا دیں گے۔

لیکن بولشویکیوں کو تباہ کرنے سے پہلے خود ہندوستان کو ایک عبرت آموز سبق دینے کی حاجت تھی۔ جس کے ہر اس جلسہ میں جو ستم زدہ ترکوں کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کی غرض سے منعقد ہوتا تھا انگریزی حکام کو بولشویکی سرگرمیاں کارفرما نظر آنے لگی تھیں اور جس کی ہر اس مجلس پر جہاں آزادی تقریر کا رنگ ذرا شوخ ہوتا تھا۔ سررشتہ تفتیش جرائم کے کارندوں کو کسی روسی سویٹ کا گمان ہونے لگتا تھا۔

اس تمہیدی سبق کا پہلا فقرہ رولٹ ایکٹ تھا جس کے رو سے حکومت کو یہ غیر محدود اختیار حاصل ہو گیا کہ جس شخص کے متعلق چاہے محض شبہ کی بنا پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے اور صفائی کا پورا موقع دیئے بغیر اسے سولی پر لٹکا دے یا جلاوطن کر دے یا ایک غیر معین عرصہ کے لئے جیل میں ٹھونس دے۔ اس ظلم عظیم کے خلاف جب ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے صدائے احتجاج بلند ہوئی اور چند ناعاقبت اندیش دل جلوں نے کچھ زیادتیاں بھی کیں، تو انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اہل ہند کے خون میں بولشویکی زہر سرایت کر چکا ہے امرتسر میں جیسا خدا کی پندرہ ہزار نہتی مخلوق پر جنرل ڈائر نے آتش تفنگ برسا کر خود سرکاری اندازہ کے بموجب پانچ سو نفوس کو قتل اور ڈیڑھ ہزار نفوس کو گھائل کر دیا تو وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ٹراٹسکی کے ہندوستانی رنگروٹوں کو خاک و خون میں ملا رہا ہوں۔ گجرانوالہ پر جب ہوائی جہازوں نے بم پھینک پھینک کر اس شہر کی بدنصیب آبادی کے پرخچے اڑائے تو ان جہازوں کے کمانڈروں کو یقین واثق تھا کہ ہم ماسکو کی پنجابی چوکی کو تہس نہس کر رہے ہیں۔ جنرل مائیکل اڈوائر اور ان کے آقا لارڈ چیمسفرڈ اور ان دونوں کے گرو گھنٹال مسٹر لائڈ جارج نے بھی آج تک اپنے اس یقین کا اعلان تو نہیں کیا۔ کیونکہ سخت جدوجہد کے باوجود انہیں کوئی ثبوت اس بات کا نہیں مل سکا کہ ہندوستان کو روس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق ہے اور دونوں کے

درمیان انگریزوں کا تختہ الٹنے کے باب میں کوئی سمجھوتا ہو چکا ہے لیکن پھر بھی انگریز من حیث القوم یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی بے چینی کا روس کی انقلابی تحریک کے ساتھ گہرا تعلق ہے باور نہ آئے تو مسٹر لاتھراپ اسٹاڈرڈ کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ ہو جو اپنی شارح آپ ہے۔

> ماسکو کا ہاتھ نہ صرف اس مفسدانہ اور باغیانہ تشدد کی تہہ میں نظر آتا تھا جو ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں سارے شمالی ہند پر چھا گئی تھی۔ بلکہ اسی ہاتھ نے برطانیہ پر افغانستان میں اس سے بھی زیادہ گہری ضرب لگائی تھی (”جدید دنیائے اسلام“ صفحہ ۲۸۶)

ہندوستانی فوج کے ایک افسر کپتان بلیکر اپنی ایک کتاب میں جس کا دیباچہ میجر جنرل سر جارج ینگ ہسبنڈ نے لکھا ہے امرتسر کے قتل عام کو ہمارے خیبری خط مصاف پر امرتسر کے باغ جلیانوالہ میں روسیوں اور افغانوں کی متحدہ شکست (آن سیکریٹ پیٹرول) ان ہائی ایشیا" (وسط ایشیا کی خفیہ طلایہ گری) مصنفہ کپتان بلیکر مطبوعہ لندن (۱۹۲۲ء) صفحہ ۲۷۵ کا پر شکوہ لقب دیتے ہیں اور از بسکہ حضور ملک معظم کی ذوات بابرکات کے ساتھ پنجابیوں کی غیر متزلزل عقیدت آپ کے فوجی ایمان کا ایک جزو ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ پنجابیوں کی وفاداری پر جو برطانیہ کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں اپنی جان پر کھیل گئے کسی قسم کا حرف آئے۔ اس لئے آپ کو ہر اس شخص کے پنجابی ہونے ہی سے انکار ہے جس کا اپریل ۱۹۱۹ء کے حوادث سے کچھ بھی تعلق تھا آپ کے خیال مبارک میں اس قسم کے تمام اشخاص کسی استثنا کے بغیر بھنگیوں، نائیوں، ڈوموں، نٹوں، کنجروں، قصائیوں، دھوبیوں، سقوں، موچیوں، بڑھئیوں اور اسی وضع کی دوسری نیچ ذاتوں کی پیداوار تھے جو بھیلوں اور گونڈوں کی طرح ہندوستان قدیم کی اصلی آبادی کی یادگار تو کہلا سکتے ہیں، لیکن آریائی النسل پنجابی نہیں ہو سکتے۔ پنجابی تو وہی ہے جو شریف ہو اور شریف وہی ہے جو ایسا سدھا ہوا ہو کہ اگر انگریز دن کو رات کہے تو وہ جھٹ کہہ دے کہ جی ہاں حضور بجا ارشاد ہوا۔ وہ دیکھئے چاندنی بھی چھٹکی ہوئی ہے اور تارے بھی

نکلے ہوئے ہیں تمام ان لوگوں کو جن کے خون سے شہادت زار امرتسر گلرنگ ہوا جن پر بم کے گولے برسائے گئے جن کو ٹکٹکی سے باندھ کر تازیانے لگائے گئے جن کو گلیوں میں پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا جن کو چلچلاتی دھوپ میں ہر روز سولہ سولہ میل پیدل چلایا گیا جنہوں نے مہینوں قید و بند کی سختیاں جھیلیں یا اور اسی نوع کی دوسری بیان گزا مصیبتوں کا خمیازہ کھینچا غیر پنجابی اراذل والانفار قرار دے کر کپتان جیکمہ [illegible] ہیں۔

"یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تیسری جنگ افغانستان کا سارا انتظام روسی سوویٹ ہی نے کیا تھا۔ علے ہذا القیاس اپریل ۱۹۱۹ء میں ادنےٰ درجہ کے کمینوں اور دوسرے دراویدی النسل غیر پنجابی طبقوں کو آمادہ فساد کرنے سے ہمارے امرتسری خطوط نقل و حرکت پر بھی سوویٹ ہی نے حملہ کیا تھا"
("خفیہ طلایہ گمری" صفحہ ۱۲۶)

غرض یہ عقیدہ کہ ہندوستان کے اضطراب کی موج گوناگوں روس ہی کے دریائے انقلاب سے اٹھی ہے انگریزوں کے دلوں میں ایسا پختہ ہو گیا ہے کہ قوی سے قوی مخالف شہادتیں بھی اسے متزلزل نہیں کر سکتیں۔ اسی عقیدہ نے چالیس ہزار ہندوؤں اور مسلمانوں کو جیل کی ہوا کھلائی۔ اسی عقیدہ نے ابوالکلام اور شوکت علی اور محمد علی اور فضل الحسن حسرت کو جو مسلمانان ہند کی آنکھوں کے تارے ہیں عقوبت کے کنوئیں جھنکائے۔ اسی عقیدہ نے ملیبار میں ماپلاؤں کی خانہ بربادی کا سامان کیا۔ اسی عقیدہ نے ریپودمن سنگھ کو نابھہ کی گدی سے اتارا اور یہی عقیدہ غریب سکھ ناتھ سے آج بھی چار لاکھ روپیہ کی رقم خطیر بطور جرمانہ وصول کر رہا ہے۔ حالانکہ گاندھی کو گالیاں دینے میں اس بیچارے کی طاقت لسانی کا غلو غالی سے غالی اینگلو انڈین سے کم نہ رہا تھا۔

برافروختگی کا ذمہ دار کون ہے

انگریز بالشویکوں کو پانی پی پی کر کوستے ہیں۔ اور جب ان پر بس نہیں چلتا تو بم کا گولہ بن کر بے دست و پا ہندوستان پر برس پڑتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی خود اپنے گریبان

میں منہ ڈالنے کی زحمت بھی گوارا کی ہے کیا سارے کا سارا قصور ہندوستانیوں ہی کا ہے۔ اور انگریز یا پاپائے روم کی طرح معصوم ہیں جن سے کسی خطا کا سرزد ہونا محال ہے؟ کیا ان کو اس حقیقت پر غور کرنے کی توفیق کبھی نہ بخشی جائے گی۔ کہ جو آگ ہندوستان میں لگی ہوئی ہے اس کا ایندھن ماسکو سے نہیں۔ بلکہ خود لندن کے کارخانہ ہیزم کشی سے لدکر آیا ہے؟ دوسری سب باتوں کو چھوڑ دو۔ صرف ایک مسئلہ عرب کو لو کیا لارڈ ریڈنگ نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے وقت مسلمانانِ ہند کو انجیل ہاتھ میں لے کر یہ یقین نہیں دلایا تھا کہ عرب کی آزادی برقرار رکھی جائے گی۔ مقاماتِ مقدسہ پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ اور جزیرۃ العرب کی ارضِ مطہر کو انگریزی فوجیں پامال نہ کریں گی؟ پھر کیا اس اقرارِ صالح اور اس پیمانِ مقدس پر انگریز قائم رہے؟ کیا بیت المقدس، بغداد، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر بلاواسطہ یا بالواسطہ آج ان کا فوجی قبضہ نہیں ہے۔ اب اگر اس کھلی ہوئی بدعہدی پر مسلمانانِ ہند آتش زیرِ پا ہو جائیں۔ تو اس برافروختگی کا ذمہ دار بولشویکوں کو قرار دینا اپنے نفس کو دھوکے میں ڈالنا نہیں۔ تو اور کیا ہے؟ انگریزوں کو اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہئیے۔ کہ جب تک عرب کے غاصبانہ قبضہ سے دستبردار ہو کر وہ اپنی گزشتہ بدعہدیوں کی تلافی نہ کریں گے۔ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان جنہیں تئیس کروڑ دوسرے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل ہے نہ خود چین لیں گے نہ انہیں چین لینے دیں گے۔ بولشویک دنیا سے مٹ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بے چینی نہیں مٹ سکتی۔ تاوقتیکہ اس کے اسباب نہ مٹ جائیں۔ مارشل لاء کا نفاذ، رولٹ ایکٹ کا اجرا و تعزیراتِ ہند کے بے پناہ شکنجہ کی گرفت جرمانوں کی بوچھاڑ، قید کی بھرمار، ہوائی جہازوں کے بم، کلدار توپوں کے گولے۔ پولیس کے تھانے ان اسباب کا سدباب نہیں کر سکتے۔

"یہ تدبیریں جمہور کے اخلاقی جذبہ کو قوت دے سکتی ہیں۔ لیکن اس کو دبا نہیں سکتیں لوگوں کو اگر یہ یقین نہ ہو۔ کہ پولیس کا رویہ حق بجانب ہے تو ایک نہ ایک دن وہ تھانوں کو دیا سلائی دکھا کر رہیں گے۔ اور پھر ان کے خلاف کوئی شہادت دینے والا موجود نہ ہوگا کہ یہ آگ کس نے لگائی تھی۔" (سرمایہ دارانہ تہذیب کا زوال" صفحہ ۱۶۷)

روسی قوم فروشوں کی معاونت کا اصل مقصد

ابتدا میں مسٹر لائڈ جارج کا خیال تھا۔ کہ بولشویکوں کی تحریک کا سرسبز ہونا محال ہے لینن اور ٹراٹسکی امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں کے اتحاد کو کبھی زک نہ دے سکیں گے اور اپنی موت خود مر جائیں گے۔ چار دن کی چاندنی کے بعد پھر وہی اندھیری رات نظر آنے لگے گی۔ لیکن جب واقعات نے اس خیال کو غلط کر دکھایا۔ تو اس نئے روسی خطرہ کے مٹانے کے لئے یہ چال چلی گئی۔ کہ خود روسیوں ہی کی جماعت کو شہ دے کر بولشویکوں سے ٹکرا دیا گیا۔ ڈینکین کولچاک یوڈینچ اور رینگل طول و عرض روس میں لینن کی افواج احمر کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے ان کی پشت پر برطانیہ کے تمام ذرائع قوت موجود تھے۔ کروڑوں روپیہ برطانیہ کے خزانہ عامرہ سے نکل نکل کر ان کی جیبوں میں پہنچ رہا تھا۔ سامان حرب کے لاکھوں من ذخائر سے ان کی عسکری طاقت بڑھائی جا رہی تھی اور پریذیڈنٹ ولسن بھی جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں ان کی حوصلہ افزائی میں بساط بھر کوشش کر رہے تھے ساتھ ساتھ انگریزی فوجیں بھی بولشویکوں کے ان اندرونی دشمنوں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ اور اس معاونت کا اصل مقصد یہ تھا کہ سارے ترکستان پر قبضہ کر کے وسط ایشیا کی چوٹیوں پر انگریزی ملوکیت کا علم نصب کر دیا جائے۔ (کپتان بلیکر اس خون شدہ آرزو کی شرح یوں کرتے ہیں۔

ترکستان کے حالات بسرعت تغیر پذیر ہو رہے تھے۔ ہماری فوج نے ایک خونریز جنگ کے بعد مرو پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور ہمیں امید تھی کہ ہم بہت جلد دریائے جیحون کے کنارے تک بڑھ کر تاشقند اور سارے ترکستان کو بولشویکوں کے سرخ پنجہ سے چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن وہ سازشیں اور ابلیسی چالیں جو ہمارے خلاف چلی جا رہی تھیں۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ گزری تھیں۔

("خفیہ طلایہ گری" صفحہ ۱۲۹)

وسط ایشیا کی تسخیر کا خواب

ان ابلیسی چالوں سے کپتان بلیکر کی مراد غالباً وہ دوستانہ تعلقات ہیں۔ جو ماسکو انگورہ اور کابل کے درمیان قائم ہو چکے تھے۔ کہ انہی کے صدقہ میں احمرین کی جنگی طاقت اپنے مخالفین کو پے در پے شکستیں دے کر اس دن کو قریب سے آئی۔ جسے کپتان صاحب نے اپنی قوم کا "روز سیاہ" قرار دیا ہے۔ انگریزی فوجیوں کو مرو سے پسپا ہو کر وسط ایشیا کی تسخیر کا خیال ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ اس پسپائی کی کیفیت کپتان صاحب نے دبی زبان سے یوں ادا کی ہے۔

ماہ فروری ۱۹۱۹ء میں قفقاز پر برطانیہ کی فوجی گرفت مضبوط ہونے لگی اور باکو کے ساتھ ہماری فوج کے تعلقات براہ راست قائم ہو گئے یہاں سے توپیں، گولی، بارود کا ذخیرہ اور عمدہ وردیاں جن کی ہمیں سخت ضرورت تھی۔ ہمارے پاس پہنچنے لگیں۔ ماہ مارچ میں ان حربی ذخائر پر کچھ افواہیں بھی متزاد ہونا شروع ہو گئیں۔ اور ہر شخص تصویر بیم ورجا بنا ہوا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ہم میں سے جو زیادہ جوشیلے تھے انہیں پوری توقع تھی کہ قیادت علیا کی طرف سے اب کوئی دم میں یہ احکام نافذ ہوا ہی چاہتے ہیں۔ کہ تاشقند پر چڑھائی کر کے ترکستان میں بولشویکوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔ لیکن جن کی طبیعتوں پر حزم و احتیاط غالب تھی ان کا قیاس اس سے بالکل مختلف تھا اور یہی قیاس آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ ہمارا یہ خواب کہ ایک دن جیحون کے نیستانوں میں سحابی پوستین والے شیر کا شکار کریں گے اور چارجوئی کی فالیزوں کے رسیلے خربوزے کھائیں گے۔ یک بیک پریشان ہو کر رہ گیا۔ ہمارے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہم نے اپنے بھولے بھالے ترکمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایران کی

طرف سے ہٹ آئے۔ (خفیہ طلایہ گری صفحہ ۱۵۶)

افغانستان دو ہی مہینہ میں آزاد ہو گیا

اس رجعت قہقہری کا صدمہ جس کا انتقام امرتسر سے لیا گیا۔ ابھی تازہ ہی تھا۔ کہ برطانوی عسکریت کے سر پر ایک اور ازغیبی گولہ گر کر بڑے زور سے پھٹا۔ یعنی امان اللہ خاں غازی نے اس فولادی زنجیر کو جس نے ۱۸۳۸ء سے افغانستان کا بند بند جکڑ رکھا تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں توڑ ڈالا اور دو ہی مہینے کی قلیل مدت میں افغانستان بھی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انگلستان کے مشہور اخبار "مانچسٹر گارڈین" کے ایک نامہ نگار مسٹر آرتھر رنسم نے ماہ جولائی ۱۹۲۱ء میں ایک طویل الذیل مضمون لکھ کر ان اسباب کو شرح و بسط سے بیان کیا تھا۔ جو اس جنگ آزادی کے محرک ہوئے۔ یہ مضمون بصیرت افروز ہونے کے ساتھ اس قدر دلچسپ ہے کہ اقتباسات ذیل کو اپنی طوالت کے لئے کسی رسمی عذر خواہی کی ضرورت نہیں وسط ایشیا میں روس کے شہنشاہانہ اقتدارات کی دور رس اور ہمہ گیر فوقیت کا تمہیدی حال قلمبند کرنے کے بعد مسٹر رنسم لکھتے ہیں۔

روس کا انقلاب خواہ اشتراکی تفلسف کے پیرایہ سے عاری بھی ہوتا۔ ضعیف اقوام کے پیدائشی حقوق کو مسلم نہ بھی قرار دیتا اور نشر و تبلیغ کے کسی قسم کے وسایط اختیار نہ بھی کرتا تاہم ضرور تھا۔ کہ اس کے فوری نتائج سے ایک نازک صورت حالات پیدا ہو جائے پرانے نظام سلطنت کے مٹتے ہی وہ دباؤ جو روس نے وسط ایشیا پر ڈال رکھا تھا۔ دفعتاً ہٹ گیا اور انگریزی فوجیں محاذ خراسان میں مشہد تک پہنچ گئیں اور سرحد ایران سے گزر کر ترکستان میں عشق آباد سے مرو تک پھیل گئیں۔ پرانا توازن قوت یک بیک جاتا رہا اور افغانوں نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ ان کا کوہستانی نشیمن جس کی آزادی کے برقرار رکھنے میں دو عظیم الشان دشمن طاقتوں کی باہمی رقابت ان کی قوت بازو کی معاون تھی اب سلامت نہیں رہا ان دونوں طاقتوں میں سے ایک کا وجود دنیا سے ناپید ہو چکا تھا۔ دوسری طاقت آگے بڑھ رہی تھی۔ سابق میں اس خوفناک گھیرے کا جواب دوسری

طاقت کا ڈر رہتا۔ مگر اب یہ ڈر بھی جاتا رہا تھا۔ افغانوں کی اس جماعت کو جس کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی یقین ہو گیا کہ آخری وقت آن پہنچا۔ موت و حیات کے فیصلہ کی یہی ساعت ہے۔ جن ڈو کتوں کے بیچ میں افغانستان، استخوان منازعت بنا ہوا تھا۔ وہ لڑ بھڑ کر اپنا جھگڑا نبیڑ چکے ہیں ان کی بھوں بھوں نے اس ہڈی کو کچھ بچائے رکھا۔ اب میدان میں جو ایک ہی کتا باقی رہ گیا ہے وہ بس کوئی دم میں چٹ گیا ہی چاہتا ہے۔ غرض اس جماعت کے دل میں یہ عقیدہ نہایت پختگی سے جم گیا۔ کہ اگر ان کی قسمت میں نصاریٰ کی غلامی ہی لکھی ہے۔ تو یہ پتھر کی لکیر کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ لیکن نوک شمشیر سے اسے چھیلنے کی کوشش کرنا بھی تو مسلمان کا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کفرۂ فجرہ کا کبھی مددگار نہیں ہو سکتا جو اس کے آزاد بندوں کے کان میں اپنے تعبد کا حلقہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور نہیں تو کچھ دنوں کے لئے تو ہمارے ملک کو ان کی محکومی سے مہلت مل جائے گی۔

حضرت غازی کی اُم محترمہ کا حریت پرور دماغ

مسٹر ر نسم کی رائے میں غازی امان اللہ خاں کی والدہ ماجدہ علیا حضرت سراج الخواتین کا دماغ ان حریت پرور افکار کی نورانی شعاعوں کا نقطۂ ماسکہ تھا اور وہ اسلامی جوش جس کی والہانہ از خود رفتگی نے لاکھوں سر بکف افغانوں کو برطانوی ملوکیت کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ اسی عالی حوصلہ خاتون کا ابھارا ہوا تھا۔ ۲۱ فروری ۱۹۱۹ء کے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے جو امیر حبیب اللہ خاں کے قتل اور غازی امان اللہ خاں مدظلہ العالی کی تخت نشینی پر منتہی ہوئے مسٹر ر نسم رشتہ بیان اس طرح سنبھالتے ہیں۔

"دو چھ ہفتہ بعد نئے امیر امان اللہ خاں نے ایک رسمی مکتوب لینن کے نام بھیج کر اپنے والد کی وفات اور اپنی مسند نشینی کی اطلاع دی۔ امان اللہ ہنوز عنفوانِ شباب میں ہے۔ عمر تیس سال سے بھی کم ہے چہرہ نہایت جمیل عادات و اطوار پسندیدہ اور ماں کی تربیت نے جذبۂ حمایت اسلام دل میں ایسا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ اس پر جنون کا گمان

ہونے لگتا ہے کم از کم ابھی تک وہ محض ایک آلہ کار بر آری ہے۔ حقیقی اقتدار کی عنان اس کی ماں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مسند نشینی کے ساتھ ہی افغانستان کی حکمت عملی کا سنگ بنیاد یہ اصول قرار پایا کہ ستم زدہ اسلام کو دشمنوں کے نرغے سے چھڑا کر اس ذروہ عروج پر پہنچایا جائے جس کا خواب اس کی ماں بیس سال سے دیکھ رہی ہے سب سے پہلے فوجی معلموں کا ایک وفد اور سامان حرب سے کچھ ذخائر بھیج کر امارت بخارا کے ساتھ حلیفانہ مراسم قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور کچھ دن بعد انگلستان کے ساتھ وہ جنگ جس کا چھڑ جانا ناگزیر تھا۔ شروع ہو گئی۔ انگریزی اخبارات کو یہ آویزش شورش پسند سرحدی قبائل کے ساتھ محض ایک معمولی سی جھڑپ یا زیادہ سے زیادہ بولشویکی ریشہ دوانیوں کا ایک نشاخسانہ بن کر نظر آئی تھی۔ لیکن افغانستان کے ارباب حل و عقد جن کے سینوں میں حرارت دینی کا طوفان موجزن تھا کچھ اور ہی خیال رکھتے تھے۔ ان کی دانست میں یہ جنگ مسائل کے تصفیہ کا ایک جزو لاینفک تھی جن کی دشواریوں کا جال فرنگستان سے لے کر قسطنطنیہ اور داغستان سے چل کر خلیج فارس تک بچھا ہوا تھا۔ اسلام کے دربار میں جہاں دوسری قومیں اپنی نثارانہ عقیدت کی نذریں لئے کھڑی تھیں۔ وہاں افغانستان کے مجاہدین بھی یہ پیش کش لے کر حاضر ہوئے تھے۔ غرض افغانوں کی نظر میں ان کا محاصرہ اعداء کے خطرہ میں گھرے ہوئے اسلام کی ایک سرحدی چوکی تھا اسی لئے ان کا انداز تیغ آزمائی وہی تھا۔ جو ایسی چوکیوں کے محافظوں کا ہوا کرتا ہے وہ نہ صرف اپنے لئے لڑے بلکہ یہ جان کر لڑے کہ ہم مشرق میں اسلام کی نجات کے لئے لڑ رہے ہیں۔"

علیا حضرت ممدوحہ کا مکتوب امیر بخارا کے نام

مسٹر نسم کی نامہ نگارانہ تگ و دو کو کس طرح علیا حضرت ممدوحہ کے ایک خط کی نقل ہاتھ آگئی ہے۔ جو آپ نے سر سید میر عالم خاں امیر بخارا کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں جس کا اقتباس مسٹر نسم کے مقالہ کی جان ہے مہد علیا دستر کبریٰ ارشاد فرماتی ہیں۔

"عزیز عالی مقام، دعائے ترقی درجات کے بعد واضح ہو۔ کہ حضرت رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم نے امت مرحومہ کو اعتصام بحبل اللہ کی تلقین کرتے ہوئے اخوت اسلامی کا جو درس دیا تھا وہ صد ہا سال کے دوران میں سلاطین اسلام اور ان کے وزراء کے باہمی تفرقوں اور ایک دوسرے کے حالات سے بے خبری کے باعث فراموش ہو چکا ہے اور اس بے بصرانہ تشتت نے یہ ڈر پیدا کر دیا ہے کہ کہیں مسلمانوں کا شیرازہ بالکل ہی پراگندہ نہ ہو جائے اور اتحاد اسلامی کی مقدس طناب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہ رہ جائے۔

ہمارے دشمنوں نے ہمارے خانہ اتی تنازعات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام اسلامی سلطنتوں کو الٹ دیا ہے اور آہستہ آہستہ تمام اسلامی آبادیاں ان کے پنجۂ ستم میں اسیر ہو کر یکے بعد دیگرے اپنی آزادی کھو بیٹھی ہیں اس عزیز بلند اقبال پر خود روشن ہو گا کہ آج اس کائنات ارضی کے جس ناحیہ اور جس گوشہ پر ہماری نظر پڑتی ہے تمام اسلامی حکومتیں اور تمام اسلامی قومیں موت کے گھاٹ اترتی دکھائی دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب صفحہ ہستی پر ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

مسلمانوں کے مقامات مقدسہ ان سے جبراً چھین لئے گئے ہیں اور مقامات خلافت پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔

ہندوستان، مصر، عرب شریف غرض تمام دنیا کے مسلمان نصاریٰ کے غلام بنے ہوئے ہیں ترکستان ماوراء النہر، ایران اور افغانستان کی آزادانہ نشو و ارتقا کا فطری حق سلب کر لیا گیا ہے مسلمانوں کے دل ان پیہم صدموں سے پاش پاش ہوتے جاتے ہیں اور میں جو زاویہ غم میں بیٹھی ہوئی بعد خضوع و تضرع اسلام کے لئے دعائیں مانگا کرتی ہوں۔ کار فرمائے قضا و قدر کے آخری فیصلہ سے بے خبر جب موت کے قدموں کی دھمک سنتی ہوں تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہوں۔

حالات کی یہ صورت تھی کہ جب میرا لخت جگر صالہا سال تک اسلام کے غم میں گھل گھل کر اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر بیٹھا اور اس نے اپنا پہلا مقدس فرض یہی سمجھا کہ اپنے

ملک کی خود مختاری اور اپنی رعایا کی آزادی کا سامان کرے اور وطن کی اس حریت کامل کے استحکام و بقا کے لئے اس طاقت کی دراندازیوں کا قلع قمع کر دے جو مدت ہائے دراز سے ہماری مخالفت پر تلی ہوئی ہے اس عزم راسخ کے ساتھ نورچشم امان اللہ نے تلوار نیام سے کھینچ کر طبل جنگ بجوا دیا اور خدائے عزوجل وحدہٗ لاشریک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کی کریمانہ کارسازی کے صدقے میں میرے بیٹے نے اپنے ضروری مقاصد حاصل کر لئے ملے بظاہر یہی قیاس کیا جائے گا کہ میرے مادرانہ آلام و افکار کا دور ختم ہو گیا ہے اور اب میرے

ملے عہد نامہ راولپنڈی نے اگرچہ افغانستان کی پیشانی سے برطانیہ کی وظیفہ خواری کا داغ رسوائی دھو کر امور داخلہ کی طرح معاملات خارجہ میں بھی افغانستان کو خود مختار تسلیم کر لیا ہے لیکن یہ خود مختارانہ حیثیت اس وقت تک کامل و مکمل نہیں قرار دی جا سکتی جب تک کہ ان دو اہم مسائل کا اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو لیتا جو افغانی سیاسیات کی جان ہیں۔

پہلا مسئلہ اٹک پار کے نیم آزاد سرحدی قبائل کی سرپرستی سے تعلق رکھتا ہے۔ برطانوی ملوکیت کو اصرار ہے کہ ان قبائل کا علاقہ اس کے دائرۂ اثر سے خارج نہ ہونے پائے۔ لیکن افغانستان جو اس علاقہ کو اپنا "الناس لوہ ین" سمجھتا ہے متقاضی ہے کہ اس کی سیادت کا حق اشتراک خون اشتراک مذہب اشتراک لسان اور اشتراک روایات کی بناء پر اسی کو پہنچتا ہے آئے دن کے قصے قضیے افغانوں اور انگریزوں کے اسی زاویۂ نگاہ کے اختلاف کا نتیجہ ہیں زیادہ دن نہیں گزرے کہ مسٹر ایلیس کے قتل اور مس ایلیس کے تخطف کی حقیقی ذمہ داری حکومت افغانستان کے سر چپک کر انگریزوں نے افغانستان کا کچھ سامان حرب کراچی میں روک لیا تھا اور فریقین کے تعلقات کی بڑھتی ہوئی کشیدگی نے ایک نئی جنگ کا خطرہ سر پر لا کھڑا کیا تھا۔ حکومت افغانستان کی مدبرانہ روش نے اگرچہ جنگ نہ ہونے دی لیکن ظاہر ہے کہ جب تک انگریزوں کے موجودہ سرحدی رویہ میں جو جارحانہ اقدام کا مترادف ہے کوئی اصولی تغیر نہ ہوگا۔ اس وقت تک یہ خطرہ بدستور باقی رہے گا اور ایک نہ ایک دن افغانستان کی چھوٹی جنگ بھی چھڑ کر رہے گی۔

لئے بجز اس کے اور کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا کہ برخوردار امان اللہ کی صحت و عافیت کے لئے درگاہ باری میں دست بدعا رہوں اور جنگ کی آرزوئے مزید کو دل میں راہ نہ دوں لیکن مسلمانان عالم کی مصیبتیں دیکھ دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں۔ کہ اگر افغانستان بالآخر

دوسرا مسئلہ جو اہمیت میں پہلے مسئلہ سے کہیں بڑھا ہوا ہے ملت افغانیہ کی اقتصادی زندگی کے آزادانہ نشوونما اور اس نشوونما کے لئے افغانستان کی جنوبی سرحد کی توسیع سے وابستہ ہے۔ اس قوم کی آزادی آج کل کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ جس کی تجارت کے لئے سمندر کا راستہ کھلا ہوا نہ ہو افغان سوئی سے لے کر موٹر کار تک اپنے تمام مایحتاج کی درآمد کے لئے انگریزوں کے دست نگر ہیں۔ اور گو از روئے معاہدہ راولپنڈی وہ اپنا تمام سامان تجارت اور ذخائر حرب جو ممالک غیر میں خریدے گئے ہوں۔ ہندوستان کی راہ سے اپنے ملک کو لے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اجازت انہیں اسی وقت تک ہے کہ انگریز ان کے رویہ سے خوش رہیں۔ کوہاٹ میں ایک محبوب خاں کے پیدا ہوتے ہی ان کا لاکھوں روپیہ کا سامان کراچی یا بمبئی کے چنگی خانوں کے کیڑوں کی نذر ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افغانوں کی قومی غیرت ان قیود کو زیادہ دیر تک گوارا نہیں کر سکتی۔ روما یا پیرس یا لندن یا نیویارک میں ان کے سفارت خانوں کا قیام سب بے کار ہے اگر انہیں اتنی بھی مقدرت نہ ہو کہ دنیا کی تجارتی منڈیوں سے اپنی ضرورت کا سامان خود اپنے یا ایسی طاقتوں کے جہازوں میں لاد کر جن کے ساتھ ان کے مراسم دوستانہ ہوں بے روک ٹوک اپنے علاقہ میں لا سکیں۔ اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ان کی جنوبی سرحد بلوچستان کے درمیانی پردہ کا مغربی گوشہ اٹھا کر خلیج فارس سے جا ملے۔ جہاں وہ اپنے لئے ایک تجارتی بندرگاہ قائم کر سکیں۔ لیکن انگریز جیتے جی اس منصوبہ کی کامیابی کو کیونکر گوارا کر سکتے ہیں تاہم اسی کامیابی میں افغانستان کی حیات جاودانہ کا راز مضمر ہے اور آج نہیں تو دس بیس سال بعد اس عقدۂ دشوار کی گرہ بھی تلوار کو ہی کھولنی پڑے گی۔

کامل اور قطعی طور پر خود مختار نہ ہوا۔ یعنی اگر میرے بیٹے کو اپنے پیارے بھائی امیر بخارا اور اپنے دوسرے برادران دینی کی لازوال ہمدردی اور رفاقت جو اسلام کی آزادی کے لئے ضروری ہے میسر نہ ہو سکے گی تو ہمارا تباہ و برباد ہو جانا یقینی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ برخوردار امان اللہ نے کفار سے جہاد کرنے کا حق اپنے لئے بطور خاص محفوظ کر رکھا ہے اور اسی لئے وہ اخوت اسلامی کے تمام پر سچی برادرانہ رفاقت کا ہاتھ اس عزیز عالی مقام کی طرف بڑھاتا ہے۔ جمہوریہ سویٹ کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات کی پہلی شرط یہی ہے کہ مسلمانان بخارا کو جو ہمارے ہم کیش و ہم مشرب ہیں آزاد و خود مختار تسلیم کیا جائے۔ قرآن مجید کو بیچ میں رکھ کر اس عزیز کے ساتھ رشتہ اتحاد و یگانگی استوار کرنے کے لئے اس سے پہلے بھی نامہ و پیام ہو چکا ہے۔

اللہ جل جلالہ و عم نوالہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے اس عالی مراتب عزیز کے اور ہمارے اور تمام مسلمانوں کے دلوں میں اخوت اسلامی کا شعلہ از سر نو جلا کر مسرت و راحت اور مودت و موافقت کے یہ مبارک دن دکھائے۔ خدائے تبارک و تعالےٰ اس عزیز کو صراط مستقیم پر ثابت رہنے کی توفیق بخشے اور اس کو اور اس کے بھائی امان اللہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہمارے ان برادران دینی کو جو راہ حق میں شہید ہوئے ہیں۔ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ والدہ امان اللہ خان۔

لارڈ جارج کے سینے میں آزاد افغانستان کا زخم جانستان

مسٹر لائڈ جارج اور اس کے مجان بادہ پیما کی نیتوں سے جو لوگ اچھی طرح واقف ہیں، وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہوں گے کہ افغانستان کی ناگہانی آزادی نے اگرچہ برطانوی حکومت کو ایک گہرا چرکا لگایا تھا۔ لیکن یہ زخم ایسا نہ تھا جسے ناقابل اندمال تصور کرنے میں برطانیہ کی مسیحائی اپنے آپ کو حق بجانب نہ سمجھتی ہو۔ سارا ایران اس وقت انگریزوں کی مٹھی میں تھا اور

انہیں پورا الیقین تھا کہ ترکوں کی قسمت کے فیصلے سے فراغت پاتے ہی وہ ایران پر اپنا مستقل فوجی تسلط جما کر اس کے سیاہ و سفید کے مالک ہو جائیں گے۔ اس وقت خیبر کی طرح ہرات میں بھی ان کے مورچے جمے ہوئے ہوں گے اور اس عسکری چکی کے دو پاٹوں میں افغانستان کا پیس ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔

ایرانی مطالبات

داماد فرید پاشا کے اس سادہ لوح وفد کی طرح جو مسٹر ولسن کے اصول چہار دہ گانہ کو وحی آسمانی سمجھ کر اور انگریزوں کی نصفت پروری کو اپنا جزو ایمان قرار دے کر اس امید کے ساتھ پیرس گیا تھا کہ مجلس صلح کے ارباب لبست و کشاد قلمرو عثمانیہ کی قطع و برید کرتے وقت ترکوں کو اپنے آبائی مرز بوم سے بے دخل نہ کریں گے بھولے بھالے ایرانیوں کو بھی ۱۹۱۹ء کے اوائل میں اس خیالی پلاؤ کی ایک لذیذ قاب کی تمنا وارسیں لے گئی تھی کہ دوران جنگ میں ان کی غیر جانب داری کا کوئی معقول صلہ انہیں ضرور ہی مرحمت ہوگا۔ ان کے مطالبات سیاسی کشوری اور اقتصادی خود مختاری کے تین ابواب پر مشتمل تھے۔ سیاسی مطالبہ یہ تھا کہ ۱۹۰۷ء والا معاہدہ روس و برطانیہ کالعدم قرار دیا جائے۔ فرنگی قونصل خانوں کا فوجی پہرہ اٹھا لیا جائے۔ اور ان غیر ملکی تر نصف خانوں کی غیر ملکی عدالتیں بھی برخاست کر دی جائیں۔ انجانے تنسیخ معاہدہ سے محض آرائش سخن مقصود تھی۔ کیونکہ انقلاب روس کے ساتھ یہ معاہدہ خود بخود کالعدم ہو چکا تھا اصل مطالبہ فقط اس قدر تھا کہ فوجی پہرے اور عدالتوں کی برطرفی عمل میں لائی جائے کشوری قسم میں جو درخواست پیش کی گئی تھی کہ ایران کے دور اقبال مندی کی قدیم جغرافیائی حدود بحال کر دی جائیں۔ مشرقی سرحد دریائے جیحون ہوتا کہ ماوراءالنہر مرو اور خیوا کا سارا علاقہ ایران میں شامل ہو جائے۔ مغربی اور شمالی و مغربی سمت میں دربند، اریوان، باکو، موصل اور دیار بکر کی وسیع و فسیح ولایات ایران سے ملحق کر دی جائیں۔ اقتصادیات کی ذیل میں ایرانی وفد کی داد خواہی یورپ کے دربار سے اپنا یہ حق منوانا چاہتی تھی کہ ترکوں انگریزوں اور روسیوں کی چہار سالہ باہم

آویزی نے ایران کو جو خوفناک مادی نقصانات پہنچائے ہیں ان کی پوری پوری تلافی ہو جانی چاہیئے۔

عہد نامہ برطانیہ و ایران

بریگیڈیر جنرل سر پرسی سائکس کو ان مطالبات کے پیش کرنے والوں کی دماغی حالت قابل رحم نظر آتی ہے (تاریخ ایران صفحہ ۱۷۱) اور لارڈ کرزن بھی اپنی ہنسی مشکل ہی سے ضبط کر سکے ہوں گے۔ واما فریدکو تو پھر بھی کارپردازانِ مجلس صلح نے بلاوا بھیجا تھا اگرچہ حالات کی ناسازگاری کے باعث سلسلہ گفت و شنید ایک غیر معین مدت کے لئے منقطع ہو گیا۔ لیکن ایران کے مہمان ناخواندہ کو ایوان مجلس میں باریاب ہونے کی سعادت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ لارڈ کرزن نے سر پرسی کاکس کو جو اس وقت طہران میں انگریزی اقتدار کی محافظت کا فرض ادا کر رہے تھے۔ کچھ ہدایات بھیجیں۔ ان ہدایات کے مطابق سر پرسی نے حکومت ایران پر ایک قہر بھری نگاہ ڈالی اس ایک ہی نگاہ نے دل کا فیصلہ کر دیا اور ماہ اگست ۱۹۱۹ء میں عہد نامہ انگلستان و ایران کے برطانوی مسودہ پر جانبین کے دستخط ثبت ہو گئے۔

برطانوی معاہدات کا تمہیدی فقرہ

برطانیہ کی وزارت خارجہ کا خاصہ ہے کہ جب وہ کسی ملک کو ہتھیانا چاہتی ہے اور اس خاصیانہ دراز دستی کی برہنگی کے عیوب کو قانون کے کفن سے ڈھانپتی ہے یعنی اس ملک کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتی ہے تو معاہدہ کے تمہیدی فقرہ میں فریق ثانی کو یہ یقین ضرور دلا دیتی ہے کہ اس کی آزادی و خود مختاری پر کوئی حرف نہ آنے پائے گا۔ اس بارے میں اس کی انقیادکا یہ عالم ہے کہ جب کسی برابر کی طاقت کے ساتھ ایسے کسی ملک کی باہمی تقسیم کے متعلق اس کا کوئی معاہدہ ہوتا ہے تو اس میں بھی تقسیم شدہ ملک کی آزادی کے ادعا کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ عہد نامہ ۱۹۰۷ء کا آغاز اس منافقانہ عبارت

سے ہوا تھا کہ "یہ عہد نامہ دولت ایران کی حریت کاملہ کے برقرار رکھنے کی غرض سے منعقد کیا جاتا ہے" ۱۹۱۹ء والے برطانوی و ایرانی عہد نامہ کی تمہیدی الفاظ اور بھی زیادہ پرشوکت ہے شاہ کجکلاہ کی حکومت کو باقرار صالح رہ رہ کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ ایران کی کامل داخلی و خارجی آزادی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے جس کا پورا پورا احترام محفوظ رکھا جائے گا۔ (تاریخ ایران صفحہ ۱۷۳)

آزادی ایران کی نوعیت

یہ احترام لارڈ کرزن نے اس طرح محفوظ رکھا کہ انگریزی فوجی مبصروں کی نگرانی میں ایک باقاعدہ ایرانی فوج کے قیام و تنظیم کا ڈول ڈال دیا جس کے مصارف کے لئے ایران کو سات فی صدی شرح سود پر بیس لاکھ پاؤنڈ کی رقم بطور قرضہ عنایت کی گئی۔ عہد نامہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سرحدات کا تصفیہ ایران کی واجبی تمناؤں کے لحاظ سے کرا دیا جائے گا۔ ساٹھ ہزار نئی ایرانی فوج کو جو انگریزی قیادت میں تربیت پذیر ہونے والی تھی، شاید یہی تصفیہ مد نظر تھا اور ایران کی "واجبی" تمنائیں مشرق کی سمت میں ماوراء النہر کے علاوہ غالباً کابل تک بھی بڑھ سکتی تھیں۔

برطانوی وسعت اقتدار پر فرانس اور امریکہ کی برافروختگی

برطانوی حلقۂ اقتدار کی اس شہنشاہانہ توسیع پر فرانس و امریکہ بہت چراغ پا ہوئے اور لارڈ کرزن اور ان کے عذر خواہوں نے اپنے نکتہ چینوں کو اس دلیل سے خاموش کرنا چاہا کہ ایران کے ساتھ جو جدید عہد و پیمان ہوا ہے اس میں برطانیہ کی خود غرضی کو مطلق کوئی دخل نہیں بلکہ محض ایک مصیبت زدہ ہمسایہ کی دستگیری کا مخلصانہ جذبہ اس قول و قرار کا محرک ہے۔ رقیبوں پر تو یہ عذر نامعقول جو خود الزام کو ثابت کر رہا تھا کیا اثر ڈالتا خود اپنے بھی اس منطق کے بے تکے پن سے متاثر نہ ہو سکے اور صاف کہہ دیا کہ

"برطانیہ نے طہران پر دباؤ ڈال کر شاہ ایران کی حکومت سے ایک دستاویز پر جسے معاہدہ کہنا اس لفظ کی تحقیر کرنا ہے دستخط کرائے۔ جس کے رو سے ایران عملاً سلطنت برطانیہ کا ایک صوبہ بن گیا" جدید دنیائے اسلام صفحہ ۱۷۴۔"

ایران میں جدید عہد نامہ کے خلاف شورش

لیکن لارڈ کرزن کی بدبختی نے اس صوبہ کو بھی زیادہ دنوں تک ان کے دامن دولت سے وابستہ نہ رہنے دیا۔ منجنیق فلک کا ایک سنگ پارہ کوزہ گر لندن کے سفالین جام کی تاک ہی میں تھا۔ ایران بھر میں نئے عہد نامہ کے خلاف شورش بپا ہو گئی اور جن وزراء نے اس پر مہر توثیق ثبت کی تھی انہیں علانیہ غدار اور خائن کہہ کر پکارا گیا۔ شوریدگان عجم کو سیدھے رستہ پر لانے کے لئے حسب معمول توپ کا وعظ شروع ہوا۔ لیکن اس مشفقانہ نصیحت نے اور الٹا اثر کیا بجائے اس کے کہ وہ کان دبا کر اس صراط مستقیم پر پڑ لیتے جو انگریزوں کی دلسوزی نے ان کے لئے تجویز کیا تھا۔ ان کی بے راہ روی روز بروز بڑھتی گئی اور تہذیب مغرب کو ان کی اصلاح کی طرف سے مایوس ہو جانا پڑا۔ بولشویکوں کو خدا ایسا موقع دے انہوں نے ایرانیوں کو خوب ہی بھڑکایا اور جب ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں وہ عظیم الشان مجلس بمقام باکو منعقد ہوئی جو موتمر امم مشرقیہ کے نام سے مشہور ہے تو صدر مجلس نے ایرانی مندوبین کو حسب ذیل پیغام دے کر جلتی پر تیل ڈال دیا۔

اے دہقین و عمال ایران! خاندان قاچار کی حکومت اور اس کے گروہ عمالدر نے صدہا سال تک تم کو لوٹا اور تمہارا خون چوسا ہے۔ اراضی پر جو شریعت اسلامی کے رو سے تمہاری مشترکہ ملکیت ہے حکومت طہران کے پٹھوؤں نے قبضہ کر رکھا ہے تمہاری یہ زمینیں ان کے بازار تجارت کو گرم کر رہی ہیں ان کے من مانے خراج کے بوجھ سے تم دبے جا رہے ہو اور جب اپنی بے سلیقگی اور بد نظمی سے انہوں نے ملک کی یہ حالت

کر دی کہ اس کی عروق و شرائین سے خود کافی خون نچوڑ نہ سکے تو پچھلے سال انہوں نے تمہارا ملک بیس ہزار اشرفیوں کے عوض انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اب انگریز ایک فوج تیار کریں گے جو تم پر پہلے سے بھی زیادہ ظلم کرے گی اور انگریزوں کی حکومت طہران اور اس کے خوانین کے نام پر ٹیکس وصول کرنے میں مدد دے گی۔ جنوبی ایران کے تیل کے چشمے بھی تمہاری نالائق حکومت انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر چکی ہے جو تمہاری دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔

(تجدید دنیائے اسلام صفحہ ۲۹۲)

ایران کی آزادی، معاہدہ ۱۹۱۹ء کالعدم

برطانیہ کا ایرانی اقتدار اب صرف چند دن کا مہمان تھا۔ آگے پیچھے داہنے بائیں ہر طرف مخالف قوتیں سرگرم عمل تھیں۔ افغانستان مطلق العنان تھا۔ اناطولیہ کی گھاٹیوں میں بپھرے ہوئے ترک خنجر گونج رہے تھے روس میں بوڑھی پنچ، کلچاک اور دینکن کی گردن جو برطانیہ کی شہ پر بلند ہوئی تھی۔ ٹراٹسکی کے قدموں تلے روندی جا چکی تھی اور جب مسٹر لائڈ جارج کی روسی امید کے آخری سہارے ڈینکن کا کھدیڑا اور رگیدا ہوا خزانہ بیڑا بحال تباہ انزلی کی بندرگاہ میں پناہ گزین ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا اور ساتھ ہی ایک زبردست بولشویکی دستہ فوج بھی ایرانی سرحد کو عبور کر کے موقع پر نمودار ہو گیا۔ تو تقدیر کے اس گھڑیال نے جس کی گونج کا تصور مسٹر اسکویتھ کو وقت سے پہلے ہی وجد میں لے آیا تھا۔ بارہ بجا دیئے۔ انگریز جس طرح مرو سے پیچھے ہٹے تھے اسی طرح طہران سے بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء والا عہدنامہ پارہ پارہ کر دیا گیا اور ایران آزاد ہو گیا۔

عہدنامہ روس و ایران

ایران کے بہت بڑے دوست سر پرسی سائیکس اس آزادی کو اس کے حق میں

ایک بہت بڑی مصیبت خیال کرتے ہیں اور اس غم میں گھلے جاتے ہیں کہ مصیبت کا یہ سر بفلک پہاڑ بے چارے ایران کے سر سے کس طرح ٹل سکے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"ایران کی بدلی ہوئی سیاسی فضا کا اندازہ اس روسی و ایرانی معاہدہ کی شرائط سے کیا جا سکتا ہے۔ جو ماہ فروری ۱۹۲۱ء میں بمقام ماسکو قلم بند ہوا۔ اس عہد نامہ کے رو سے روس نے قرضہ کی اس رقم خطیر کو معاف کر دیا جو ایران سے واجب الوصول تھی اور اس کے علاوہ کوئی نقد معاوضہ لئے بغیر اپنی تمام ایرانی مراعات سے بھی اپنے حلیف کے حق میں دست کشی اختیار کر لی۔ ان مراعات میں تمام روسی سڑکیں اور گودیاں، جلفا سے لے کر تبریز تک کی ریلوے، جھیل ارومیا کا سلسلہ جہاز رانی اور تمام اراضیات و عمارات وغیرہ شامل تھیں۔ البتہ بحیرہ خزر کا قیمتی حق ماہی گیری اس حوالگی کی عمومیت سے مستثنٰے تھا۔ معاہدہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر کوئی غیر طاقت ایران پر حملہ آور ہو گی تو فریقین متحدہ طور پر اس کا مقابلہ کریں گے۔"

"موسم گرما میں پانچ سال تک معطل رہنے کے بعد مجلس مبعوثین منعقد ہوئی۔ ارکان مجلس نے اپنی تقریروں سے ثابت کر دیا کہ ان کے دلوں میں برطانیہ کی عداوت گھر کر چکی ہے۔ حالانکہ ایران کے شمالی و مغربی علاقوں سے اپنی فوجیں ہٹا کر انگریزوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی نیت بخیر ہے۔ لیکن نیتوں سے تو صرف ان لوگوں کو قائل کیا جا سکتا ہے جو ان کے سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ ایرانیوں جیسی بے مغز اقوام پر جو چھوٹے بچوں کی طرح اپنی ضد پر اڑ جاتی ہے کسی منطق کا خواہ وہ کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو کیا اثر ہو سکتا ہے مجلس مبعوثین کے ارکان نے عہد نامہ ایران و انگلستان پر غیر دوستانہ لہجہ میں لے دے کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ان وزراء پر بھی برس پڑے جنہوں نے اس عہد نامہ کے متعلق برطانیہ کے ارباب حل و عقد سے گفت و شنید کی تھی اور بھری مجلس میں علی الاعلان کہہ دیا کہ یہ سب وزیر نمک حرام اور غدار ہیں۔"

"ماسکو کے ساتھ معاہدہ کرنے کے علاوہ مجلس نے افغانستان، آذربائیجان اور کمال پاشا کے ساتھ بھی نامہ و پیام شروع کر دیا۔ جس کا یہ مقصد تھا کہ بیرونی خطرہ سے ایران کو محفوظ

رکھنے کا سامان کیا جائے کیونکر بدلی ہوئی صورت حالات میں (یعنی برطانیہ کا فوجی اقتدار اٹھ جانے کے باعث) ایرانی بالکل بے دست و پا ہیں اور ان کے تنومند و قوی ہیکل ہمسائے جب چاہیں ان کے ملک کو تاخت و تاراج کر سکتے ہیں۔"

"غرض مطلع ایران اس وقت تیرہ و تار نظر آتا ہے۔ ایران کو خود تو یہ توفیق بخشی نہیں گئی کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تیغ بکف ہو۔ اس کا پرانا دوست برطانیہ اس کی پشت پناہ تھا اس دلی دوست سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور برطانیہ کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کم از کم موجودہ حالات میں اس ناشکری قوم کو اپنی قسمت پہ چھوڑ دے۔ خزانہ کی یہ حالت ہے کہ بالکل خالی ہو رہا ہے۔ برطانوی مشیر مال اپنے عملہ سمیت طہران سے رخصت ہو چکا ہے۔ فارس کے صوبہ کا امن قائم رکھنے کے لئے دو چھ ہزار جوانوں کا جو دستہ فوج انگریزی کی نگرانی میں سادہ تھا پرشیا رینجز (بیشی تفنگچیان ایران سمت جنوبی) کے نام سے قائم کیا گیا تھا وہ برخاست کر دیا گیا ہے اور انگریزی خاتونین اور ان کے بچے شیراز کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔"

"ایران کے دوست اس کے اس حال تباہ کو دیکھ دیکھ کف افسوس ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ امید کرتے ہیں کہ یہ صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے گا اور اس پر جلد یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ جو رستہ اس نے اختیار کیا ہے وہ تباہی اور بربادی کا رستہ ہے"

("تاریخ ایران" صفحات ۱۷۵ اور ۱۷۹)

اس پر سخت تحریر میں جس کا ایک ایک فقرہ ظرافت کی پوٹ ہے سر پرسی کاکس کو ایرانیوں سے یہ بڑا شکوہ ہے کہ ان کی اندھی کھوپڑی میں کوئی معقول بات نہیں سما سکتی اس کتاب کے پڑھنے والے سننا چاہتے ہوں گے کہ وہ معقول باتیں کیا ہیں۔ جنرل صاحب نے اپنی "تاریخ" کے کئی صفحے ان کی تفصیل سے سیاہ کئے ہیں۔ یہاں صرف چند فقرات کے التقاط پر اکتفا کیا جاتا ہے فرماتے ہیں۔

ایران ایک بھائیں بھائیں کرتا ہوا غیر آباد ویرانہ ہے اور اگر تیل کے چشموں سے قطع نظر کیا جائے تو اس مفلس ملک میں کوئی ایسی زرعی یا اقتصادی

دولت موجود نہیں جس کا لالچ کسی یورپی طاقت کو اس کی تسخیر کی دعوت دے سکے۔ لیکن ایرانیوں کی قوم ایسی شیخی باز واقع ہوئی ہے کہ اپنے بے آب و گیاہ صحراؤں اور دلدلوں کو جنت کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے اور اس لغو خیال کو دل سے دور نہیں ہونے دیتی کہ انگریز اس جنت پر تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران کے ساتھ تین سو سال سے ہمارے تعلقات چلے آتے تھے کچھ تو ان دیرینہ تعلقات کی بنا پر کچھ ایران کے شاندار عہد ماضی کو مدنظر رکھ کر اور کچھ بتقاضائے ہمدردی بنی نوع ہم نے اپنا فرض سمجھا تھا کہ اس مصیبت زدہ ملک کی دستگیری کریں لیکن جو خود بیں اور خود ستا قوم جان بوجھ کر ہلاکت کے گڑھے میں گرنا چاہتی ہو اسے کسی کی بے غرضانہ جدوجہد کب بچا سکتی ہے" تاریخ ایران" صفحات ۱۷۵ و ۱۷۶)

انگور کھٹے ہیں

اگر انگریز طہران میں رہ جاتے اور قضا انہیں اپنے "فرض" کی "بے غرضانہ بجا آوری کی مہلت دے دیتی تو جرنیل صاحب کی اس منطق کے دندان شکن ہونے میں کلام نہ تھا لیکن اب تو یہی کہا جائے گا کہ انگور کھٹے ہیں۔

مصیبت زدہ ایران کی دستگیری کے جذبۂ صادق نے دورانِ جنگ میں انگریزوں کو مجبور کر دیا تھا کہ لاکھوں روپیہ کی لاگت سے پختہ سڑکوں کا ایک جال طول و عرض عجم میں بچھا دیں۔ بغداد سے لے کر بحیرہ خزر کے ساحلی شہر انزلی تک ایک ایسی نفیس شاہراہ تعمیر کر دی گئی تھی جس نے موٹرکاروں کی آمد و شد کو آسان کر دیا تھا۔ بوشہر سے تا بہ شیراز اور بندر عباس سے براہ شیراز تا بہ اصفہان دو اور پکی سڑکوں کی تیاری کا یہی مقصد تھا۔ اس طور پر فوجی نقل و حرکت اور سامان حرب کے لانے اور لے جانے کے لئے ٹرکاروں اور موٹر لاریوں کو ایک ہزار میل سے زائد فاصلہ طے کر لینے میں کوئی دقت نہ تھی۔ ایران سے بادل ناخواستہ رخصت ہونے وقت جرنیل صاحب

نے سارا روپیہ جو ان سڑکوں کی تعمیر پر خرچ ہوا تھا از راہ غایت فراخ حوصلگی ایران کو بخش دیا ہے۔

شکم پرست مسافر کی حکایت

اس پر ہمیں معاً اس شکم پرست مسافر کی حکایت یاد آگئی جو توشہ میں کچھ باقر خانیاں باندھ کر کشتی پر سوار ہوا تھا۔ رستہ میں بھوک لگی تو سکان پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ اتفاقاً ایک باقر خانی ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر پڑی لئیم تو تھا ہی ملاح سے کہنے لگا کہ بھئی اگر باقر خانی نکال لاؤ تو ایک ٹکڑا تمہیں بھی دوں گا۔ اس غریب کی ساری عمر نان جویں کھاتے گزری تھی ایسی باقر خانیاں خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ جھٹ دریا میں کود پڑا لیکن غوطہ پر غوطہ لگانے کے باوجود کچھ ہاتھ نہ آیا۔ لئیم کو جب یقین ہو گیا کہ ڈوبی ہوئی باقر خانی اب ہاتھ نہیں آسکتی تو منتقیانہ لہجہ میں پکارا کہ جا رے لقمہ تم تجھے خواجہ خضر علیہ الرحمۃ کی روح پر فتوح کے حوالے کیا۔ سر پرسی کاکس کی فیاضی اور اس مسافر کی بخشش آپس میں لگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔

انگریزوں کی مشرقی حکمت عملی کے اس کسی قدر طویل تبصرہ سے فارغ ہو کر اب ہم پھر سر پرسی کاکس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو طہران کی ناکامی کا داغ سینے میں چھپائے بغداد تشریف لے آئے تھے تاکہ وہ دولت لازوال جس پر کوڑ مغز ایرانیوں کی حق ناشناسی اور احسان فراموشی نے لات مار دی تھی بالغ نظران عرب کے سامنے پیش کی جائے۔

روزنامہ "زمیندار"

۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۷ء

صیہونیت اور اسلام

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

فاروق اعظمؓ اور صلاح الدینؒ ایوبی کی ارواح مقدسہ اعلیٰ علیین میں آج وقف اضطراب ہوں گی کہ مسلمانوں کا وہ اولین قبلہ جس کی تطہیر کے لئے اس عالم عنصری میں اُن کی خارا شگاف تلواریں میانوں سے برق کی طرح تڑپتی ہوئی نکلی تھیں۔ ایک ہزار سال تک امن و امان اور صلح و سلام کا گہوارہ رہ کر پھر شرک و رجس کا عفونت کدہ بنا ہوا ہے۔ پرستارانِ صلیب جن کے جابرانہ تفوق کا اس ارض مقدس میں انسانیت کبریٰ کے نام پر خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ پھر یہاں اپنی پوری قہرمانی طاقتوں کے ساتھ مسلط ہیں اور ارباب بصیرت یہ دیکھ دیکھ کر دنگ ہیں کہ یہودیت جو فرزندان اسلام کی طرح تثلیث پرستوں کے خون کی بھی پیاسی تھی اس ۱۹۲۹ء میں مسیح ابن مریم کے مغربی نام لیواؤں کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی ہے۔ انگریزوں نے اپنی مشرقی حکمت عملی کے عیارانہ مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کر لیا ہے کہ فلسطین میں ایک یہودی نو آبادی قائم کی جائے جس کی پشت پر برطانیہ کی پوری عسکری طاقت ہو۔ طول و عرض عالم سے یہودیوں کو جو خدائے قدوس کے غضب میں گرفتار ہو کر در در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں جمع کر کے یہاں بسایا جائے ان کے سرمایہ کو مشرق ادنیٰ میں اپنے استعماری منصوبوں کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے فلسطین کی عربی آبادی کو جس میں آج سے چند سال پہلے یہودی عنصر اتنا ہی تھا جتنا آٹے میں نمک ہوا کرتا ہے رفتہ رفتہ اس عنصر کے اضافہ سے قطعاً مسلوب الاقتدار کر دیا جائے یہاں

تک کہ سارا فلسطین ایک صیہونی پستونی ہو جائے جس کی ہیبت نالی حجاز اور نجد کی کنپٹی کو ہر وقت تاکتی رہے اور اس طرح پر برطانیہ کے تمام مشرقی مقبوضات ہمیشہ کے لئے آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر مجبور کر دئے جائیں جو کچھ اس وقت فلسطین میں ہو رہا ہے وہ ان سارے سیاسی نکتوں کی ایک خونچکاں شرح ہے۔

جب جنگ یورپ چھڑی اور اس بدبخت ازلی نے جس کا نام حسین ابن علی تھا خلافت عثمانیہ کے خلاف علم تمرد و طغیان بلند کر کے نصرانیوں سے رشتہ جوڑا اور توحید سے اپنا تعلق توڑا تو انگریزوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ترکوں کو کس طرح ایسی خوفناک شکست دی جاسکتی ہے کہ وہ حجاز سے اپنا تعلق منقطع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ جب تک بیت المقدس دولت عثمانیہ کے قبضہ میں تھا اس قسم کی کوئی زک انہیں دی جاسکتی تھی۔ اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ قاہرہ اور قدس کو ایک دوہری پٹڑی کی ریل سے ملا دیا جائے جو جزیرہ نمائے سینا کے سینہ کو چیرتی ہوئی یروشلم کے جگر میں برطانی استعمار کے نیزہ کی خوں فشاں انی کو جا گاڑے۔ یہ ریل اس وقت تک نہ بن سکتی تھی جب تک بے شمار سرمایہ اس پر نہ لگا دیا جاتا اس سرمایہ کا سب سے بڑا حصّہ یہودی مہاجنوں کی جیب سے نکلا۔ جو آج مغرب کی تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی جنگی مہمات کو اپنے قارونی خزانوں سے کامیاب بنانے میں ایک خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ ایک نل آئے جو دریائے نیل کے تازہ پانی سے اس پانچ لاکھ فوج اور اس کی بہیر و بنگاہ کو سرمایہ حیات بہم پہنچاتا رہے۔ جس نے نتیجہ اقدام کرتے ہوئے وقت مقررہ پر تین لاکھ جاں باز ترکی فوج کو فولادی محاذ یروشلم کے قریب جا توڑا۔ شریف کے بیٹے فیصل نے اس کام میں نصاریٰ کا خوب ہی ہاتھ بٹایا۔ ہندوستان اور مصر کے فرزندان توحید نے بھی اس سلسلہ میں اپنی سیزدہ صد سالہ روایات کی خوب ہی مٹی پلید کی اور جب انگریزوں کا قبضہ ارض مقدس پر ہو چکا تو ساری مسیحی دنیا کی طرف سے تہذیب انسانی کے اس اجارہ داروں کو فلسطین کی حکمداری کا منصب تفویض ہو گیا۔ اس حکمداری کے آئین کا اصل الاصول اس سانہ بانہ کے لحاظ سے جو صیہونیوں

کے ساتھ کی گئی تھی مسٹر بالفور کا یہ اعلان تھا کہ فلسطین میں ایک یہودی نوآبادی قائم کی جائے گی۔

عربوں نے اسلام کے ساتھ جو غداری کی اور نصاریٰ کا ساتھ دے کر اپنوں سے دغاکار رشتہ جس طرح توڑا اس کا خمیازہ وہ جلد ہی کھینچنے والے تھے۔ آزادئ عرب کے نام پر جو سبز باغ انہیں دکھائے گئے تھے ان کی پاپائی بہار بھی جلد ان کی آنکھوں کے سامنے آ جانے والی تھی۔ کہ مسٹر بالفور کا اعلان فوراً سے فعل میں آنا شروع ہو گیا۔ باہر سے لا کر یہودی جوق در جوق فلسطین میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ جنگ یورپ سے پہلے ان کی تعداد فلسطین میں صرف چھ ہزار تھی۔ برطانیہ کی صیہونی حکمت عملی کے صدقہ میں آج وہ ایک لاکھ ستر ہزار ہیں اور بڑھتی آبادی کے ساتھ ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کا یہ عالم ہے کہ اب وہ عربوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔

دیوار براق کا قضیہ چند سال کا پرانا ہے۔ بے بصروں کو اس قضیہ میں صرف ایک خفیف سی مذہبی کشمکش کے آثار نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ مذہبی کشمکش ایک خوفناک سیاسی و اقتصادی آویزش ہے۔ جس میں برطانی اور صیہونی اتحاد کی یہ دھمکی چھپی ہوئی ہے کہ عربوں کے پیدائشی حقوق مٹا دیئے جائیں گے اور یہودیت زیر سایہ برطانیہ طول و عرض فلسطین میں مختار جزو و کل ہو گی۔

اس قضیہ کے سلسلہ میں یہود و عرب کی مہیب آویزش نے فلسطین کی زمین کو عربوں کے خون سے لالہ زار کر دیا۔ انگریزوں کے ہوائی جہاز ان کے سروں پر گولوں کی بارش کر رہے ہیں۔ امریکہ کے دس ہزار یہودی سورما لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو کر آ رہے ہیں۔ اور تو اور کلکتہ کے ایک یہودی مسٹر کوہن بھی مردن کر میدان میں اترنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ برطانیہ کے آہن پوش جہاز بھی مالٹا سے پہنچ گئے ہیں۔ طول و عرض سلطنت سے متحرک فولادی قلعوں۔ آہن پوش، جہازوں، عقاب پرواز طیاروں کو حرکت میں لایا جا رہا ہے۔ سامان اسلحہ اور ذخائر حرب جمع کئے جا رہے ہیں۔ اور ان تمام کارروائیوں کا مطلب یہ ہے کہ بالفور کی حکمت عملی کو کامیاب بنایا جائے۔ یہ

دیکھ کر تمام عالم اسلامی میں ایک اضطرابِ عظیم رونما ہو رہا ہے مسلمانانِ بغداد و برطانیہ کی اس کارروائی کے خلاف پرزور احتجاج کر چکے ہیں۔ مصر کے مسلمانوں میں سخت ہیجان ہے اور بظاہر یہ ہنگامہ ایک عالمگیر جنگ پر منتج ہونے والا ہے۔ چونکہ عربوں کی عام اس سے کہ وہ دمشق میں رہتے ہوں یا ریاض میں، مکہ میں بستے ہوں یا بغداد میں، تہذیب تمدن، معاشرت اور زبان ایک ہے۔ اس لئے اس ہنگامے کو رو کنے کی صحیح تدبیر یہ تھی کہ فلسطین کا انتداب سلطان ابن سعود کو دے دیا جاتا۔ لیکن انگریز کسی مشرقی سرزمین پر سے اپنی استعماری گرفت آہنی آسانی کے ساتھ کہاں ڈھیلی کرتے ہیں، چنانچہ "ڈیلی نیوز" نے اپنی ایک تازہ اشاعت میں لکھ دیا ہے کہ اگرچہ سلطان ابن سعود کے ساتھ ہمارے مراسم دوستانہ قائم ہیں۔ لیکن ہم اس دوستی کو بہ نگاہ اعتماد نہیں دیکھ سکتے اور فلسطین کی ٹکڑا ہی کو کسی حال میں چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں۔

"انگریزوں کو واضح رہنا چاہیے کہ وہ آگ کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ عرب ہندوستانی نہیں کہ ہر قسم کی ذلت کے باوجود غلامی پر قانع رہیں اور اگر وہ اسی طرح یہود کی پیٹھ ٹھونکنے اور عرب کے جذبۂ حریت کو کچلنے کی مساعیٔ نافرجام میں منہمک رہے تو نہ صرف عربوں بلکہ تمام آزاد اسلامی ممالک کے رہنے والوں کو اس بات کی دعوت دیں گے کہ وہ یہود کو نکالنے اور اس سرزمین کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے متحد ہو جائیں۔ فلسطین کے سات لاکھ مسلمان مرنے مارنے کے لئے تیار ہیں۔ مصر، عراق اور شام کے عرب فرداً فرداً ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر چکے ہیں۔ صحرا میں رہنے والی مخلوق لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت ناموس اسلام کے لئے کٹنے مرنے کے لئے تیار ہے اور اگر انگریز چاہتے ہیں کہ معاملہ زیادہ پیچیدگی اختیار نہ کرے تو ان کو ایک لمحہ کے بغیر اعلان بالفور منسوخ کر دینا چاہئے۔"

تعجب ہے کہ مسلمانان ہند اس وقت تک خاموش ہیں۔ انہیں اسلام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ فلسطین کے ان غیور عربوں کا ہاتھ بٹاؤ جو نامِ اسلام کی خاطر جانیں ہتھیلی پہ رکھ کر استبداد کے مقابلہ میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ پس وقت آگیا ہے کہ وہ فوراً اٹھیں اور اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ جو گوناگوں مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں، لفظی نہیں بلکہ عملی ہمدردی کے لئے تیار ہو جائیں اور طول عرض کشور میں جلسے کر کے حکومت برطانیہ پر یہ حقیقت واضح کر دیں کہ اگر اس نے جلد بالفور کے اعلان پر خطِ تنسیخ نہ پھیرا اور فلسطین میں اپنی موجودہ حکمتِ عملی میں تبدیلی نہ کی تو اس سلسلہ میں جو ناخوشگوار واقعات ظہور پذیر ہوں گے۔ ان کا نتیجہ برطانیہ کے مشرقی اقتدار کے حق میں کچھ بہت زیادہ خوشگوار نہ ہوگا۔

روزنامہ "زمیندار"

۵ ستمبر ۱۹۲۹ء

مغربِ اقصیٰ میں ہلالِ و صلیب کی نئی آویزش

پھر پرچمِ اسلام ہے عالم میں سرافراز
پھر دینِ ہدیٰ کی وہی شوکت وہی شان دیکھ
پھر زمزمۂ نغمہ سرایانِ حرم سن
پھر قافلۂ یثرب و بطحیٰ کو رواں دیکھ

۲۷ر مئی ۱۹۲۶ء کے ماتمی دن کی یاد ملتِ بیضا کے جگر میں مدتوں چٹکیاں لیتی رہے گی۔ کیونکہ اس دن غازی عبدالکریم کو جن کا نیزۂ خوں فشاں میڈرڈ کا سینہ چیرتا ہوا پیرس کے جگر پر جا پہنچا تھا، مشیتِ ایزدی کے ان بوجھے مصالح کے آگے سر جھکا کر فرانس کی عافیت سوز شرائط تسلیم کر لینی پڑیں اور وہ امیدیں خاک میں مل گئیں جو مغربِ اقصیٰ میں صلیب پرستوں کے اقتدار کی تباہی و بربادی اور اسلام کے عروج و سربلندی کے متعلق پیدا ہو چلی تھیں۔ فرانس اور ہسپانیہ کی استعماری رقابت جس کی گود میں یہ امیدیں سالہا سال سے پرورش پا رہی تھیں اس مہیب خطرہ کی سرشاری پر ختم ہو گئی کہ مجاہدینِ اسلام آج اگر ہسپانیہ کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہو گئے تو کل فرانس کی بھی خیر نہیں۔ دونوں صلیبی طاقتوں کو جو کبھی ایک دوسرے کی حریف تھیں اسلام کے اس مشترکہ خطرہ نے حلیف بنا دیا۔ مراقش دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مغربی حصہ جس میں ریف بھی داخل ہے۔ ہسپانوی لیٹروں کو ملا اور مشرقی حصہ فرانسیسی ڈاکوؤں کے ہاتھ آیا۔

غازی عبدالکریم کی مجبورانہ سپر انگنی کے بعد مجاہدین ریف کی دینی غیرت نے پھر بھی میدان نہ چھوڑا اور وہ اپنی اسی فوق العادت بسالت سے جس کا لوہا ایک دنیا مان چکی ہے، ہسپانیہ کے فنون حربی قاہرہ کا قافیہ تنگ کرتے رہے۔ یہ جاں گسل مقابلہ چھ مہینہ تک جاری رہا آخر فرانس اور ہسپانیہ کی ملی بھگت بازی لے گئی اور ۱۹۲۶ء کے خاتمہ پہ تھکے ہارے مسلمانوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے، اور ان کا دین و ایمان، ننگ و ناموس اور مال و متاع ان کے خونخوار مسیحی آقاؤں کے قدموں کی نذر ہو گیا، کہ اسے جس طرح چاہیں، ٹھکرائیں، جس طرح چاہیں روندیں۔"

مسیحیت اس ہزار سالہ رسوائی کا بدلہ جو اسے اسلام کے ہاتھوں مشرق و مغرب میں نصیب ہوئی ان اسلامی ممالک سے جس پر اس کی ملوکیت کا جھنڈا جا گڑتا ہے مغربی تہذیب کے ساتھ ساز باز کر کے اس عیاری سے لیتی ہے جو اسی کا حصہ ہے۔ ہر شہر میں شراب خانے کھول دیئے جاتے ہیں چکلے قائم کر دیئے جاتے ہیں۔ تھیٹر جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ مدرسوں میں لامذہبی کی تعلیم دی جاتی ہے اسلام کی تضحیک و تحقیر کے لئے مغربی ادب کا ذخیرہ کوڑیوں کے مول فروخت کیا جاتا ہے اور ان گوناگوں ابلیسی ہتھکنڈوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ اور جسم پر صلیبی فالج گرا کر انہیں ایسا بیکار کر دیا جاتا ہے کہ ان کی حالت اپاہجوں سے بدتر ہو جاتی ہے۔ فرانس اس فن انتقام کا ماہر خصوصی واقع ہوا ہے اور اپنے مراقشی حلقۂ اثر میں اسلام کی بیخ کنی کے لئے توپ و تفنگ کی تمہیدی سرگرمیوں کے بعد انہیں مہلک زہر حربوں سے کام لے رہا ہے مارشل لیاتی جو مراقش کے فوجی گورنر جنرل ہیں۔ اسی حکمت عملی پر کاربند ہیں اور اگر چندے یہی لیل و نہار رہا تو وہ سرزمین جس سے کبھی المرابطین اور الموحدین اٹھے تھے۔ توحید کے تصور اور یقین کے ذوق سے قطعاً نا آشنا ہو جائے گی

ہسپانیہ تہذیب جدید کے اس سلیقہ سے محروم ہے اس کی سنگدلانہ شقاوت جس نے دنیا سے اندلس کے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اس بقیۃ السیف آبادی کی نسل کے ساتھ بھی جو کسی نہ کسی طرح جان بچا کر جبل الطارق کے

اس بار گئی۔ وہی اگلا سا انتقامی سلوک کرنے پر تلی ہوئی ہے غازیان ریف کے اطاعت اختیار کر لینے کے باوجود ہسپانویوں نے ان پر ایسے ایسے مظالم توڑے کہ روح ان کے تصور سے بھی لرزا اٹھتی ہے۔ یہ ظلم عظیم احرار ریف کے سمند غیرت کے حق میں تازیانہ بن گیا اور وہ اسی مجاہدانہ جوش و خروش سے پھر تلواریں سونت کر اپنے کوہستانی نشیمنوں سے نکل آئے جو سالہا سال تک ہسپانیہ کو خاک و خون میں تڑپا چکا ہے۔

ریڈر نے قسم کھا رکھی ہے کہ اسلامی ممالک کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی برقی اضافہ نہ کرے گا۔ وہ یہ تو بتا دیتا ہے کہ آج مصطفےٰ کمال بال میں ناچے آج ترکی خاتونوں نے برقع اتار پھینکا آج انگورہ کے فلاں شخص کو انگریزی ٹوپی نہ پہننے کی علت میں پھانسی پر لٹکا دیا لیکن جہاں کوئی اسلامی ببر کسی مسیحی بھیڑیے کی ہڈیاں چٹ کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ اس کی ساری خبر رسانی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ مراقش میں آج ایک نیا معرکہ کشت و خون گرم ہے۔ جو غازی عبدالکریم کی یاد کو تازہ کر رہا ہے۔ مگر ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ پچھلی ولایتی ڈاک میں البتہ "ٹائمس" اور "مانچسٹر گارڈین" اور "سیٹرڈے ریویو" کی مختلف اشاعتوں کے چند مقطوعات موصول ہوئے جن سے یہ پردہ اٹھا اور ہمیں معلوم ہوا کہ اسلام کا پرچم مراقش کے میدان کارزار میں پھر بصد فخر و ناز لہرا رہا ہے۔ ریف کے غازیوں کی بے پناہ تلواریں ہسپانویوں کو جو تنگ کرنے میں مصروف ہیں اور کبھی کبھی فرانس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہیں۔

"ٹائمس" کا مراقشی نامہ نگار اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل میں لکھتا ہے کہ ہسپانویوں نے اپنے علاقہ میں جبر و تشدد کا وطیرہ اختیار کر رکھا تھا جس کی تاب نہ لا کر قبائل ریف کی بڑھتی ہوئی بے چینی نے کھلم کھلا تمرد کی شکل اختیار کر لی۔ کوئی دس دن کا واقعہ ہے کہ شریف سلاطین خلیشی جو ریف کے ایک سر برآوردہ امیر ہیں اور کل تک ہسپانویوں کے حلیف تھے، مجاہدین کی جماعت سے جا ملے اور اب وہی ان کی قیادت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت تک نو قبائل علم جہاد بلند کر چکے ہیں اور ان کی جنگی طاقت جو ہسپانیہ اور فرانس کے لئے بے حد پریشان کن ثابت ہو رہی ہے روز بروز

بڑھتی چلی جاتی ہے مجاہدین نے باب صلیب کی ہسپانوی چوکی کو جو بہت بڑی فوجی اہمیت رکھتی تھی گھیرے میں لے لیا۔ اس چوکی کی فوج نے بعد مشکل جان بچا کر فرانسیسی علاقہ میں جا پناہ لی۔ اسی کے ساتھ مجاہدین نے سوق طلیتین کے فوجی مرکز پر نہایت بے جگری سے حملہ کیا اور اس کی محصور فوج کو تہ تیغ کر کے مرکز پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی نے مجاہدین کے حوصلے بہت کچھ بڑھا دیئے اور ان کی فتح و ظفر کی خبر نے ہزارہا مسلمانوں کو جو اب تک گھروں میں بیٹھے تھے ان کے ساتھ لا ملایا۔ ایک ہسپانوی افسر میجر استار نے چار سو سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر باب صلیب پر از سر نو قبضہ کرنے کے لئے بڑھا۔ مگر خود بھی کئی افسروں سمیت مارا گیا۔ اور اس کا دستہ فوج بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ قطاعہ کی فوجی چھاؤنی سے ایک اور ہسپانوی جیش نے باب صلیب کا رخ کیا، مگر مجاہدین نے اسے بھی تلوار کی باڑھ کے آگے رکھ لیا اور اسے سر پر پاؤں رکھ کر بجانب شمال بھاگنا پڑا۔

طیطوان کے جنوب و مغرب میں قائد عبدالکریم اوارقی نے بازار جدال و قتال گرم کر رکھا ہے۔ ان کے مقابلہ پر ایک مختصر سا ہسپانوی دستہ فوج بھیجا گیا تھا۔ اس کے پندرہ سپاہی کھیت رہے اور باقی بحال تباہ پسپا ہوئے قبیلہ بنی غمارہ کے علاقہ میں قائد بدریہ نے غنیم کی تین فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا اور اس سڑک پر جو طیطوان سے شیشوان کو جاتی ہے مجاہدین نے ایک غضبناک حملہ کر کے ہسپانیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔

فرانس اس جہاد حریت کو اندیشہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور ہسپانیہ کی فوجی کارروائیوں میں برابر کا شریک ہے رباط اور طیطوان میں ہسپانوی اور فرانسیسی افسران فوج سرگرم مشاورت ہیں ان مشوروں کی ضرورت اس لئے اور بڑھ گئی کہ مجاہدین نے ہسپانیوں کے ساتھ ان کے فرانسیسی حلیفوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ تین ہفتے ہوئے انہوں نے وزان کے مشرق میں ایک فرانسیسی چوکی پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور جو جنگ اس موقع پر ہوئی تھی اس میں فرانسیسی کمانڈر موسیو پرہ جنیاں کام آیا تھا۔ غرض سارا ریف اس وقت میدان جہاد بنا ہوا ہے۔ اور ہسپانیوں پر غازیان اسلام نے از سر نو عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے شعلہ حرب و ضرب کی چنگاریاں اڑ اڑ کر فرانسیسی حلقہ اثر پر بھی جا پڑتی ہیں اور مراقش کی سرزمین میں صلیب پرستوں کی عافیت سخت خطر میں پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر مجاہدین اسلام کا بول بالا کرے اور ان کے بازوؤں کو وہی طاقت عطا فرمائے جس نے کبھی خیبر کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

روزنامہ "زمیندار" یکم مئی ۱۹۲۷ء

مغرب الاقصیٰ میں غازیانِ اسلام کا فاتحانہ اقدام

رونقِ بزمِ دودۂ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

خیلِ ملک ہے اس کے جلو میں یعنی فضائے عرش بکف ہیں
تاکہ جہاں ہو درہم برہم صلی اللہ علیہ وسلم

اٹھے ہیں پھر اسلام کے غازی سر سے لگی ہے کفر کی بازی
جھک نہ سکا توحید کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم

"مغرب اقصیٰ میں ہلال وصلیب کی نئی آویزش" کے عنوان سے دو ہفتہ قبل ہم نے ایک طویل الذیل افتتاحیہ سپردِ قلم کیا تھا۔ جس کے مطالعہ سے قارئین کرام کو معلوم ہوا ہوگا کہ غازی عبدالکریم کی مجبورانہ سپرافگنی کے بعد آتش حریت کا وہ شعلہ جس کی سربلندی افسرِ فرنگی کا صلیب پرستانِ فرانس و ہسپانیہ کو یقین ہو گیا تھا۔ مجاہدین مراقش کے مردِ غیرت کی ایک ہی جنبش سے پھر نہایت تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھا ہے اور ہسپانویوں اور فرانسیسیوں کو اپنی جان کے نئے سرے سے لالے پڑ گئے ہیں۔ رابرٹ نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ اگر کسی اسلامی خطہ میں مسلمان اپنے حریفوں کو ناک چنے چبواتے ہوئے دیکھے جائیں تو منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جائے گا اور ہمارے کان میں ان کی چیرہ دستی کی بھنک بھی نہ پڑنے دے گا لامحالہ ولایتی ڈاک کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو شکر ہے کہ ابھی تک سہ رقابت مطبوعات کی احتسابی زد میں نہیں آئی۔ اس ہفتہ انگلستان سے جو اخبارات آئے ان سے کارزار مراقش کی مزید تفصیل معلوم ہوئی جس کا مفاد ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"مارننگ پوسٹ" اور "مانچسٹر گارڈین" یہ خبر سناتے ہیں کہ ۱۳۔اپریل کو بحرِ روم کے مراقشی ساحل کے اس حصہ پر جو ہسپانوی علاقہ اثر میں داخل ہے دفعتہً ایک ایسا خوفناک

طوفان آیا جس کی ہیبت کی نظیر پیش کرنے سے زمانہ حال کی تاریخ یکسر قاصر ہے آسمان کے پٹ کھل گئے اور مینہ موسلا دھار برسنا شروع ہو گیا بجلیاں کڑکنے لگیں جھکڑ چلنے لگے، سمندر کی موجیں پہاڑ بن بن کر اٹھنے لگیں، ہوا میں زمہریری کیفیت پیدا ہو گئی اور کوہ و صحرا برف کی سفید چادر سے ڈھک گئے۔ سو سو فٹ اونچی موجیں بندرگاہوں میں گھس کر جہازوں سے ٹکرائیں اور انہیں گودیوں سے نکال کر قعر بحر میں لے گئیں تار ٹوٹ گئے برقی روشنی بجھ گئی۔ شہروں میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ بے شمار شہری اور مضافاتی آبادی یا تو سمندر میں غرق ہو گئی یا سردی سے ٹھٹھر کر مر گئی۔ سامان حرب کے بے شمار ذخیرے سینکڑوں ہزاروں گھوڑے اور دوسرا بے حساب سامان جنگ ایسا تلف ہوا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ بارونق بندرگاہیں کھنڈر ہو کر رہ گئیں۔ اور ان فوجوں کا جو نقش کی گرفتار بلا ہسپانوی فوج کی کمک کے لئے آرہی ہیں ساحل پر اترنا مشکل ہو گیا۔ ۱۵ - اپریل تک اس سارے نقصان کا اندازہ تین کروڑ روپیہ سے اوپر کیا گیا تھا اور اس کے بعد جو نقصان ہوا اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ ہسپانیہ جیسی کم مایہ سلطنت کے لئے جس کا اقتصادی کچومر گذشتہ ریفی معرکوں کے بے حساب مصارف پہلے ہی نکال چکے ہیں۔ یہ نیا نقصان اس روایتی تنکے سے کم نہیں جو غریب اونٹ کی بار زدہ کمر کو توڑ دیا کرتا ہے۔ حکومت ہسپانیہ کا بیان ہے کہ یہ بلائے آسمانی جو یوں یک بیک نازل ہو گئی ایک عظیم الشان قومی حادثہ کا حکم رکھتی ہے۔ پایہ تخت میڈرڈ کی آبادی پر یاس و ہراس طاری ہے اور عام رائے یہ ہے کہ بحر روم کا یہ تباہ کن طوفان منطقہ بغاوت کی حدود کو وسیع تر کر دے گا اور باغیوں کی سرکوبی کے لئے ایک بڑا لشکر بھیجنا پڑے گا۔

جن مجاہدین کو ہسپانیہ والے باغی کہتے ہیں انہوں نے یقیناً اس بلاخیز طوفان کے کاندھے پر ملائکہ کو سوار دیکھا جن کے جنود مجندہ آسمان سے ان کی مدد کو اترے تھے کیونکہ اخبار "طان" جو فرانس کا سب سے زیادہ با اثر جریدہ ہے اپنی ۱۶ - اپریل کی اشاعت میں رقمطراز ہے کہ مجاہدین کے حملے بہت بڑھ گئے ہیں۔ الاثام لگے

نواح میں جہاں پچھلے دنوں ایک خونریز معرکہ ہوا تھا مجاہدین اسلام نے ہسپانویوں کی چار زبردست فوجی چوکیوں پر ایسا زبردست دباؤ ڈالا کہ ان کی محصور افواج کو بحال تباہ پسپا ہونا پڑا۔ علاقہ بنی بشیر میں ایک اور فوجی چوکی پر بھی مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۲۔ اپریل کو مقام جبل عزیل پر مسلمانوں اور صلیب پرستوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا مسلمانوں کو کامل فتح ہوئی اور ان کے حریف کچھ تو گاجر مولی کی طرح کٹ کر کھیت رہے اور جو بچے وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔

وہی آسمانی قوتیں جنہوں نے ۱۲ اپریل والے بلا انگیز طوفان کی شکل میں ظاہر ہو کر ہسپانویوں کے مقابلہ میں مجاہدین مراقش کی امداد کی تھی اپنی غیبی نصرت کا کرشمہ ایک دوسری شکل میں بھی دکھا رہی ہیں۔ فرانس اور ہسپانیہ جو غازی عبدالکریم کا بے پناہ زور توڑنے کے لئے کچھ دیر کو ایک ہو گئے تھے۔ آپس میں پھر پھٹ گئے۔ عداوت اور بغض کا وہ ازلی و ابدی بیج جو اللہ تعالےٰ نے ان سرکشوں کے دل میں بو رکھا ہے اگا اور جلد ہی برگ و بار لے آیا۔ لندن کا اخبار "ابزرور" لکھتا ہے کہ طنجہ کے مسئلہ پر فرانس اور ہسپانیہ میں شدید اختلاف رونما ہو گیا ہے اور کچھ عجب سے وہ مراقش کے جنگجو اسلامی قبائل کے خلاف متحدہ کارروائی کرنے کے ناقابل ہو گئے ہیں۔ ہسپانیہ طنجہ میں فرانس کے حقوق پر دست تعدی دراز کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ طنجہ کی زمین کا ایک انچ بھی مجھے ریف کے سارے علاقہ سے زیادہ عزیز ہے فرانس تو اس دعوے کو شوخ چشمانہ سمجھتا ہی ہے یورپ کی دوسری سلطنتیں بھی اس کے اس مطالبہ کی سخت مخالف ہیں۔ فرانس و ہسپانیہ کا یہ شدید اختلاف مجاہدین کے حق میں ایک بہت بڑی رحمت بن گیا اور "ابزرور" کا خیال ہے کہ اس اختلاف سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر مراقشی قبائل نے جو جارحانہ کارروائی نہایت وسیع پیمانہ پر کی ہے۔ اس سے تن تنہا عہدہ برا ہونا ہسپانیہ کے لئے ممکن نہیں اور مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ جو قبائلی ناٸیر ہسپانیہ نے مجاہدین کے مقابلہ پر بھیجے تھے۔ وہ بھی اپنے صلیب پرست اولیاء نعمت کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اسلامی بھائیوں کے ساتھ جا

ملے اور اب سب کے سب مل کر ہسپانیہ کا قافیہ تنگ کر رہے ہیں۔

فرانس کے حلقۂ اثر کی یہ حالت ہے کہ ہسپانوی علاقہ کے خونریز ہنگاموں کی گونج اب اس کی فضا سے بلند ہونے لگی ہے۔ "ٹائمز" اپنی ۱۷ اپریل کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ فرانسیسیوں نے اپنی سرحدات کی حفاظت کے لئے زبردست فوجی دستے جابجا متعین کر دیئے ہیں اور اگرچہ اس کے علاقہ میں قبائل نے ابھی تک علم جہاد بلند نہیں کیا۔ لیکن ان کی تلواریں میان سے تڑپ تڑپ کر باہر نکل آنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فرانسیسی حلقۂ اثر میں سردست کوئی جنگی کارروائی نہ کریں گے۔ پہلے وہ ہسپانیہ کو تگنی کا ناچ نچائیں گے۔ اور جب ان کا تیا پانچا کر چکیں گے تو پھر کسی دوسری طرف متوجہ ہوں گے۔ خدا ان کے بازوؤں کو عالمگیری کی قوت بخشے اور ان کے ملک کو کفار کے تسلط سے آزاد کرے۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز

روزنامہ "زمیندار"

۱۵ مئی ۱۹۲۷ء

شرارت کی جڑ

ہندوؤں اور مسلمانوں کے امکان اتحاد کا وہ رفیع الشان قصر جسے خلافت اور کانگرس کی چند روزہ موالات نے تعمیر کیا تھا، جب باردولی والے بھونچال کے ایک ہی جھٹکے میں پیوند زمین ہو گیا اور کاشی و کلکتہ کی سرگوشیوں نے احمد آباد کے سادھو کو کال کوٹھری میں بند کر کے شر و فساد کی اس نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس کی فصیل پہ آج سنگٹھن کا سرخ جھنڈا لہرا رہا ہے تو راقم زندان منٹگمری میں اسیر تھا۔ تخیل کے موقلم کو معاً جنبش ہوئی اور حقائق ذیل کی تصویر پردۂ معانی پہ اتر آئی۔

سب تیری کمیٹی ہوئی دولت ہوئی غارت
بنتے ہی بگڑ کیوں گئی قسمت تری بھارت

گاندھی کی بسائی ہوئی بستی ہوئی برباد
دو سال کی محنت ہوئی پل بھر میں اکارت

ہم ڈھونڈنے نکلے ہیں کھنڈر اس کے ثمر میں
تھی بام ثریا سے بھی اونچی جو عمارت

گرما گئے تھے جس سے ٹھٹھرتے ہوئے اعضا
باقی نہ رہی جسم کے اندر وہ حرارت

اس خون کا اک قطرہ بھی دل میں نہیں موجود
جس سے دم شمشیر کی ہوتی تھی طہارت

رہرو تو بہت ہیں مگر ایسا کوئی رہبر
ملتا نہیں رکھتا ہو جو آنکھوں میں بصارت

دہلیز حکومت پہ سرِ عجز جھکا کر
لینا بہت آسان ہے قلمدانِ وزارت
گرتے ہوؤں کو بھی کوئی تھامے یہ ہے دشوار
پیدا نہیں کرتا کوئی اس فن میں مہارت
کیوں ہند کی تقدیر نے کھایا ہے یہ پلٹا
بوجھی گئی اب تک نہ کسی سے یہ بجھارت
مسلم کی خطا ہے نہ یہودی کی ہی تقصیر
یہ سب ہے فقط ایک برہمن کی شرارت

اس کے بعد جو قیامت ہندوستان کے سر پہ گذری اس کی خوں چکاں حکایات کوہاٹ اور راولپنڈی سے چل کر دہلی و سہارنپور اور لاڑکانہ و اندور سے لے کر کلکتہ و باری سال کے در و دیوار پر نقش ہیں۔ کانگرس ایک وجود معطل ہو کر رہ گئی خلافت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آئیں، اور ہندو مہاسجا نے پنڈت مدن موہن مالوی کی سرکردگی میں آریہ سماج کے زہریلے پروپیگنڈے کا آلہ کار براری بن کر طول و عرض ملک میں فتنہ و شر اور فراق و تشتت کی وہ آگ بھڑکائی کہ ہندوستان جو کچھ دنوں پہلے حقیقت میں جنت نشان نظر آنے لگا تھا۔ اچھا خاصا آتش کدہ آذر بن گیا۔ جہاں پہلے صلح و سلام اور آشتی و دارات کے چرچے تھے۔ اب نفرت و حقارت اور جنگ و پیکار کے تذکرے نقل محفل بن گئے۔ پنڈت موتی لال نہرو کی پھولوں کی چھڑی کی جگہ ڈاکٹر مونجی کے ڈنڈے نے لے لی، مسز سروجنی نیڈو کی شیریں سخنی کی قائم مقام لالہ لاجپت رائے کی تلخ نوائی بن گئی آریہ اخباروں کی ہر اشاعت میں اسلام کی روایات کا مضحکہ اڑایا جانے لگا۔ آریہ پرچارکوں کی ہر تقریر میں مسلمانوں کو اور ان کے پیشوایان دین کو مغلظات سنائی جانے لگیں۔ ہندو نوجوان کو ڈنڈے، لاٹھی، بنوٹ اور جنت اقلگنی کی تعلیم دی جانے لگی کہ آئے دن کے مقابلوں اور مقاتلوں میں مسلمانوں پر اپنی جوانمردی کی دھاک بٹھا سکیں۔ مسلمانوں کی مسجدوں کے سامنے ڈھول پیٹ، پیٹ کر اور سنکھ بجا بجا کر محض اس نیت سے ان کی عبادت میں خلل ڈالا جانے لگا کہ وہ

تنگ اگر مزاحم ہوں اور جاتی کے مہابیروں کو اپنے نئے حربوں کی آزمائش کا موقع ملے مسلمانوں کے لئے من حیث القوم غنڈوں کا لقب تجویز کیا گیا اور ہندو عورتوں کے اغوا کی فرضی داستانیں تصنیف کر کے انہیں ساری دنیا میں رسوا کرنے کی سازش کی گئی۔ سوراج کے حصول کے لئے یہ سب کچھ کافی نہ سمجھ کر انہیں مرتد کرنے کے لئے لاکھوں کروڑوں روپے جمع کئے گئے کہ ان کا ایمان بھی سلامت نہ رہنے پائے اور وہ پورا کفر میں جذب ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنی جداگانہ اسلامی ہستی کھو بیٹھیں۔ ہر صبح کا آفتاب اگر طلوع ہونے کے ساتھ ہی کسی نہ کسی خوفناک چپقلش، کسی نہ کسی خونریز ہنگامہ کی خبر لاتا ہے، تو یہ ان تمام حالات کا منطقی نتیجہ ہے۔

حکومت یہ سب کچھ دیکھتی ہے مگر خاموش ہے۔ کبھی کبھی جب اسے اپنے اولین فرائض جہانبانی کا احساس ہوتا ہے۔ تو کلدار توپوں کی آتش فشانی اس بہر سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ اس کے گورے اور گورکھے موقع پر پہنچتے ہیں اور نہتے مجمع پر چند گولیاں برسا دیتے ہیں۔ کچھ لاشیں خاک و خون پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ کچھ سسکتے ہوئے زخمی لاریوں میں بھر کر ہسپتال میں پہنچا دئے جاتے ہیں اور حکومت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ پھر چند مہینے گذر جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر توپ کا وعظ دہرا دیا جاتا ہے۔ اگر ان کشتوں اور ان زخمیوں میں سنگھٹنی سورماؤں کا بھی شمار ہوتا اور موت کی سکرات اور جراحتوں کی اذیت بحصہ رسدی انہیں بھی ملتی تو شاید حکومت کی تدبیر کسی حد تک کارگر ہو جاتی کیونکہ ان سورپیروں کو سینوں میں گولیاں کھا کر پھر بھی اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے کی قابلیت پیدا کرنے کے لئے ابھی ایک مدت دراز چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ حکومت کی کلدار توپوں کی گولیوں کی بارش صرف ان مسلمانوں کے لئے ہے جو خانہ خدا کے ناموس کی حفاظت کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں جانتے۔ اس وقت سنگھٹن کے بپھرے ہوئے شیر بھیگی بلی بنے ہوئے کسی کونے میں جا دبکتے ہیں۔ فروری سنہ ۱۹۲۶ء سے لے کر مارچ سنہ ۱۹۲۷ء تک حکومت کی اژدردم توپوں کی گولہ باریوں میں ایک سو پچانوے نفوس کی شمعِ زندگی گل کرنی پڑی اور ایک ہزار چھ سو بچاسی بدنصیبوں کے جسموں پر وہ گھاؤ ڈالنے پڑے جن کا اندمال مہینوں میں جا کر ہوا۔

یہ شہیدانِ وفا اکثر و بیشتر فرزندانِ توحید تھے ۔ مالوی جی کے مہابیر اگر ہوں گے بھی تو خال خال

دنیا حیران ہے کہ وہ باجبروت سلطنت جس نے جرمنی جیسے بے پناہ حریف کا سر غرور نیچا کر دیا جس کے قشونِ قاہرہ کی ہیبت سے مشرق و مغرب کے قلب پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، آدھی دنیا کے خزائن اور سامان حرب و ضرب پر قابض ہونے کے باوجود ہندوستان میں کیوں یک بیک ایسی کمزور ہو گئی اور اس کے تفلق و تدبر کا جس کا لوہا ساری دنیا مانتی ہے دفعۃً کیوں ایسا دیوالہ نکل گیا کہ وہ اس ملک میں امن و امان بھی قائم نہیں کر سکتی ۔ جس کا قیام اس ملک میں اس کی بقا کی اولین و آخرین وجہ جواز ہے۔ اگر وہ چاہے تو کیا ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا سر پھوڑنے سے روک نہیں سکتی اور اگر نہیں روک سکتی تو اس کا کیا حق ہے کہ وہ یہاں دھرنا دیئے بیٹھی رہے۔ کیوں نہیں اپنی تہذیب کا تابوت لے کر یہاں سے رخصت ہو جاتی ۔ وقت آگیا ہے کہ اس سوال کا جواب اس سے سختی کے ساتھ طلب کیا جائے ۔ معاصر "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی کی اشاعت مورخہ ۲۸ر اپریل ۱۹۲۶ء میں اس کے ایک نامہ نگار نے یہی برمحل سوال کر کے ان جذبات کو عالم آشکار کر دیا ہے ۔ جو مدتوں سے سینوں میں چھپے ہوئے تھے اور "ٹائمز آف انڈیا" نے اس پر ایک ہنگامہ خیز مقالہ افتتاحیہ لکھ کر خدایانِ شملہ کی عافیت میں تھوڑی دیر کے لئے خلل ڈال دیا ہے ۔

پرسوں شب جو قیامت یک بیک مسلمانانِ لاہور کے سر پر ٹوٹ پڑی ۔ اور کل صبح کا آفتاب ان سوختہ سامانوں کے لئے جن نئی مصیبتوں کا روح فرسا پیغام لایا ۔ اس کی پیش پا افتادہ عمومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے معاصر "ٹائمز آف انڈیا" کے نامہ نگار کی حسب ذیل تحریر کا حرف حرف صداقت کی روح اور حقیقت کی جان ہے ۔

ہر صبح کو اخبار کھولتے ہی پڑھنے والے کی اندیشہ زدہ نگاہ اس کے اوراق پر اس تلاش میں پڑتی ہے کہ ملک کے کسی گوشہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی خونریز ہنگامہ تو نہیں ہوا مشتعل انبوہ پر پولیس نے گولیاں تو نہیں چلائیں ۔ اور اگر چلائی ہیں تو مقتولین کا شمار کس

قدر ہے اور مجروحین کی تعداد کتنی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صوبجات کی حکومتوں کے قوائے حکمرانی بالکل مسلوب و مفلوج ہو چکے ہیں۔ قیام امن و امان کے بلند بانگ ادعا کے باوجود ان میں ایک متمدن حکومت کے اولین فرائض کی بجا آوری کی قابلیت موجود نہیں ہے اور ایک نہتے مجمع کو منتشر کرنے کے لئے وہ صرف گولہ توپوں اور رائفلوں کی آگ برسانا ہی جانتی ہیں۔ اہل ہند حکومت انگریزی سے یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے۔ ملک کے لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے فرائض سے موثر طریقہ پر عہدہ برآ ہو کر ہندوستان میں میں ایک مہذب نظام جہانبانی کی حیثیت سے رہنے کی خواہش مند ہے یا اپنی بے دست و پائی کی معترف ہو کر یہاں سے چلا جانا چاہتی ہے؟ حاکمانہ ذمہ داری کے چکنے چپڑے فقروں کو دن رات دہرا دہرا کر جی خوش کر لینے سے کام نہ چلے گا۔ ہم قول اور فعل میں تطابق دیکھنا چاہتے ہیں اور اس تطابق کی یہ حالت ہے کہ فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائی کے تسلسل کا انقطاع اس کے بس کا روگ نہیں رہا۔ آئے دن شدید فرقہ وار نقصانات جان کی طولانی فہرست حکومت کی انتظامی قابلیت کی قلعی کھول رہی ہے۔ وقت کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آیا وہ انگریز جن کے ہاتھ میں آج ہندوستان کے نظم و نسق کی باگ ہے اپنے ان پیش روؤں کے دل و دماغ سے محروم ہو چکے ہیں، جنہوں نے ہندوستان میں برطانیہ کا اساس جہانبانی استوار کیا تھا؟ آیا ان میں وہ زبردست قوت فیصلہ باقی نہیں رہی، جس نے ہندوؤں کی ہائے ہو سے بے نیاز ہو کر ستی کی وحشیانہ رسم کو بجبر مٹا دیا تھا اور اس بات کی کچھ پروا نہ کی تھی کہ ان کا یہ فعل مذہب میں جابرانہ مداخلت سے تعبیر کیا جائے گا؟ آج حالت ایسی نازک ہو رہی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مذہب کے نام پر ہندوستان میں آئے دن

خون کی ندیاں بہائی جاتی ہیں۔ یہ سیلاب خون کب تک یوں ہی جاری رہے گا۔؟

ایک فرزانہ و نکتہ رس حکومت کے اعضا کے لئے ان خوفناک فسادات کے اسباب دریافت کر لینا کوئی بڑا مشکل کام نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ان فسادات کا اصلی باعث آریہ سماج کی جنگ جویانہ اور معاندانہ روش ہے۔ دھرم کا گھونگھٹ منہ پر ڈال کر اس نے اپنا زہر سیاسی اجال ملک کے کونہ کونہ میں بچھا رکھا ہے اور فرقہ وار فسادات کی تہ میں اس کی اشتعال انگیزیاں صاف چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیا حکومت انگریزی اپنے بازوؤں میں اس قدر طاقت موجود پاتی ہے، کہ اس آریہ سماجی تحریک کو دبا دے؟ اگر ہے تو اسے ایک لمحہ کی تاخیر بھی روا نہ رکھنی چاہیئے۔ ورنہ اور بے شمار خاندانوں کی خیر نہیں۔ اور اگر نہیں ہے، تو وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی حکمرانی کا بستر لپیٹ لے اور اس ملک کا انتظام اس ملک کے باشندوں کے حوالے کر کے چلتی پھرتی نظر آئے۔

"ٹائمز آف انڈیا" نے اپنے نامہ نگار کی تصریحات پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں نکتہ چینیوں کے عام افتاد طبیعت کے لحاظ سے اس مبالغہ و اطرا کا تھوڑا بہت عنصر ضرور موجود ہے۔ جو نکتہ چینی کو موثر بنانے کی غرض سے اس قسم کے تمام ایرادات میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے، کہ مبالغہ کی آمیزش سے پاک ہونے کے باوجود نامہ نگار کے دعاوی اور مطالبات میں ایسے امور ضرور موجود ہیں۔ جن کی صحت و درستی سے انکار نہیں ہو سکتا اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے ان پر غور کرے۔ سب سے اول اسے فرقہ وار فسادات کے کسی ایک سبب یا متعدد اسباب کی تلاش و جستجو پر اپنی مساعی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صرف کرنا چاہیئے اور ان الزامات کی تحقیق کرنا چاہیئے جو آریہ سماج پر لگائے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں حکومت کو ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ شدھی اور سنگھٹن

اور تنظیم کی تحریکات نے ہندوستان کے امن و امان کو درہم برہم کرنے میں کیا حصہ لیا ہے اور کہاں تک لیا ہے۔ پھر اگر بعد التحقیقات حکومت پر ثابت ہو جائے کہ ان سارے فسادات کا سرچشمہ اور اس ساری شرارت کی جڑ آریہ سماج ہے تو اس کے قلع قمع کرنے میں اسے ذرا بھی متامل نہ ہونا چاہیئے - اگر حکومت اپنی اسی موجودہ روش پر قائم رہی کہ پولیس کی ان تخفیف شدہ جمعیت کی مدد سے جس پر ہندوستان کے داخلی امن کا انحصار ہے فتنہ و شر کے سوبرے راہزن کی ایک آدھ گرون کبھی کبھی قلم کر دیا کرے اور ان رومانی خواجہ صاحب کی طرح جو بعد از خرابی بصرہ بیدار ہوئے تھے، فسادات کے پھوٹ پڑنے پر بجائی امن کی طرف متوجہ ہوا کرے تو مستقبل نہایت تاریک نظر آتا ہے اور جب یہ دیکھا جاتا ہے، کہ بعض ذمہ دار اشخاص نے دلال میں سخت اشتعال انگیز اور منافرت پرور تقریریں کی ہیں تو قیام امن و امان کی رہی سہی امیدیں ختم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں

ہمارے معاصر کا خیال ہے کہ اگر حکومت نے فرقہ وار فسادات کے اسباب کی تحقیقات کے بعد آریہ سماج کو قصور وار پاکر اس کے خلاف کوئی کارروائی کی تو سارے ملک میں شور مچ جائے گا، کہ "دھرم خطرے میں ہے" لیکن کسی حکومت کو انسانیت کے اولین حقوق کی حمایت میں جب کہ اس "خطرہ" سے خود انسانیت ہی خطرہ میں ہو، کسی ایسے شور کی پروا نہ کرنی چاہیئے۔ یہ شور بلند ہو چکا ہے۔ سندھ ہندو پراونشل کانفرنس کے اجلاس سکھر منعقدہ ۱۸ مئی میں "شیر پنجاب" لالہ لاجپت رائے اس طرح گرجے۔

آریہ سماج کو دبا دینا ایک خونریز جنگ کے اعلان کے مترادف ہوگا اور جس دن گورنمنٹ نے یہ اعلان کیا، اس دن ساری کی ساری ہندو دنیا اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی اور سوراجیہ کی جو جنگ بھارت نے شروع کر رکھی ہے۔ وہ بھی اسی دن فتح ہو جائے گی۔

حکومت کے جسم پر تو شاید اس غضبناک للکار سے لرزہ طاری ہو گیا ہو اور وہ "ٹائمز آف انڈیا" کے مشورہ پر کان دھرنا شاید اپنے امپریل مصالح کے خلاف سمجھے

لیکن مسلمانوں کے لئے وقت کے اس سیواجی کا یہ بھبکی کا سا گرو ڈاکٹر منجی کی پٹنہ والی چنگھاڑ کے بعد ایک اور درس عبرت و موعظت ہے۔ جو قوم برٹش گورنمنٹ کو ایسی ایسی خوفناک دھمکیاں دینے کا کس بل اپنے جسم میں پیدا کر چکی ہے اس کے سامنے ایک ایسی بے دست و پا ملت جس کے ہاتھ میں نہ لاٹھیاں ہیں نہ کرپانیں نہ اینٹیں ہیں نہ تیزاب کی پچکاریاں حقیقت میں کیا رکھتی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آریہ سماج کو اپنی سرگرمیوں کی تحقیقات سے، اگر یہ سرگرمیاں سراسر امن پسندانہ ہیں، اندیشہ کس بات کا ہو سکتا ہے۔ شدھی اور سنگھٹن اگر فی الحقیقت بالکل بے ضرر تحریکیں ہیں تو عند التحقیقات ان کی معصومیت پر خود سرکار کی طرف سے مہر توثیق ثبت ہو جائے گی۔ وقت سے پہلے اس اظہار غیظ و غضب اس مظاہرہ جوش و خروش کے معنی ہی کیا ہیں۔ اور "ٹائمز آف انڈیا" نے تو شدھی اور سنگھٹن کے ساتھ تنظیم کی تحریک کو بھی محک تجربہ کے حوالہ کر دیا ہے آریہ سماجیوں کے لئے بڑا اچھا موقع ہے کہ تحقیقات کا مجوزہ کمیشن اس تحریک کی بال کی کھال نکال کر ان کے اس بار بار کے دہرائے ہوئے دعوے کی تصدیق کر دے کہ ہندوستان میں جس قدر فساد آج تک ہوئے ہیں ان کے ذمہ دار نہ مالوی ہیں نہ منجی ہیں، نہ لاجپت رائے بلکہ کچلو اور ظفر علی خاں کے فتنے کار ہیں شدھی سنگھٹن اور تنظیم کی سرکاری تحقیقات سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی تحریک حقیقت میں سرچشمہ فساد ثابت ہوئی تو اس کے بجبر دبا دیئے جانے کے بعد فضا بالکل صاف ہو جائے گی اور حکومت کو آئے دن نہتے مجمعوں پر گولیاں چلا کر اپنی وحشیانہ بے تمیزی کی نمائش پر مجبور نہ ہونا پڑے گا۔ جس نے اسے مہذب اقوام عالم میں آج رسوا کر رکھا ہے۔

لاہور میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ کبھی نہ ہوتا اگر حکومت اس ملک کے بین الاقوامی جسم کے رستے ہوئے ناسور کا علاج تشدد کے پھاہے کے بجائے تدبر کے مصفیات سے کرتی حکومت کو اگر اس ملک میں امن اور چین سے رہنا ہے تو رعایا میں امن اور چین پیدا کرنے کی تدابیر سوچے اور سر دست سب سے بڑی تدبیر یہی ہے کہ فسادات کے اسباب دریافت کئے جائیں اور پھر ان اسباب کا ازالہ پوری قوت کے ساتھ کیا جائے۔ اگر حکومت نے ہمارے اس مشورہ پر عمل کیا تو ملک کے تمام دردمند حلقے امن کی مساعی کو بہ نگاہِ استحسان دیکھیں گے۔ روزنامہ "زمیندار" ۷ مئی ۱۹۲۷ء

ہندوستان کا امن خطرہ میں

ستیارتھ پرکاش کی عافیت سوز تعلیم

دشنام بہ مذہبے کہ طاعت با فتند

مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

اس وقت جبکہ ملک فتنہ و فساد کا گھر اور اختلاف و افتراق کا جولان گاہ بنا ہوا ہے، ہر امن پسند انسان کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اس منافرت و معاندت کے اسباب پر غور کرے اور بقدر امکان اُن کے ازالہ کے لئے کوشش کرے اور جس سبعیت و بربریت کے مظاہرے آج ہندوستان کے ہر گوشے میں ہو رہے ہیں اس کے استیصال کے لئے کمر ہمت چست کرے کیونکہ اسی مر پھٹولی نے اہل ہند کو اقوام عالم کی نظروں میں ذلیل و حقیر کر کے منزل آزادی سے کوسوں دُور پھینک دیا ہے۔

اسی خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے وہ مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کیا تھا جو "زمیندار" کی ۱۷ اگست کی اشاعت میں قارئین کی نظر سے گزرا اور جسے دیکھ کر "ملاپ" آپے سے باہر ہو گیا۔ ہم نے نہایت نیک نیتی سے اس میں لکھا تھا کہ دونوں اقوام کے درمیان جو نفرت اور مغائرت اس وقت موجود ہے۔ اس کا منبع اور سرچشمہ ستیارتھ پرکاش کا تیرھواں اور چودھواں باب ہے۔ اور چونکہ اس بات کے باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ یہ باب الحاقی ہیں اس لئے ہر امن پسند اور عافیت دوست شخص کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ ان ابواب کو کتاب سے خارج

کرانے کے لئے جدوجہد کرے۔

ستیارتھ پرکاش کے مصنف کا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ یہ کتاب الہامی ہے اس لئے اگر اس کا وہ حصہ جو منبع نفرت و فساد اور سرچشمۂ فتنہ و فساد ہے اس سے خارج کر دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آریہ سماجی حسب ضرورت اس میں تحریف و تصرف کرتی رہتی ہیں اور کوئی نیا اڈیشن اس کتاب کا ایسا شائع نہیں ہوتا جس میں کچھ نہ کچھ ردوبدل نہ کیا گیا ہو۔

ہم نے یہ تحریک نہایت معقولیت سے اور نیک نیتی سے کی تھی اور ہمارا انداز تحریر اس پر شاہد ہے۔ مقالہ محولہ فوق میں ہم نے صرف یہی لکھا تھا کہ ابواب زیر نظر میں پیغمبر اسلام علیہ التحیہ والسلام کی توہین کی گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جملہ مذاہب کے پیشواؤں اور جملہ انبیاء کرام کو پیٹ بھر کر گالیاں دی گئی ہیں اور لکھنے والے کے قلم نے حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کی شان میں ناپاک سے ناپاک الفاظ استعمال کئے ہیں خوفناک سے خوفناک زہر چکانی کی ہے اور جملہ صحائف سماوی کا مضحکہ نہایت دل آزار پیرایہ میں اڑایا ہے مگر "ملاپ" ہمارے اس مضمون پر سخت برہم ہوا ہے اور اس نے کھلم کھلا مسلمانوں کو اور حکومت کو ایک ہولناک جنگ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ان علل و وجوہ کو بہ تفصیل بیان کریں جو ہماری تحریر کے محرک ہوئے۔

آریہ سماج کی تحریک ایک سیاسی تحریک ہے اور ستیارتھ پرکاش کا حرف حرف ہمارے اس خیال کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ جن اشخاص نے اس کا مطالعہ بالاستیعاب کیا ہے ان پر یہ حقیقت روشن ہے۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جس سے ہر شخص بہ سہولت اندازہ کر سکتا ہے کہ آریہ سماج نے مذہب کے نام سے اصلاح کی بنیاد ڈالی دراصل میں خالص سیاسی تھی اور اس سے مدعا یہ تھا کہ ہندوستان کی سرزمین کو غیر ہندوؤں کے وجود سے پاک کر کے خالص ہندو راج قائم کیا جائے۔ جس کا امتیاز خصوصی یہ ہو کہ گاؤ کشی کو نا نہ تقدیس ہو

چنانچہ ستیارتھ پرکاش کے صفحہ ۲۱ پر یہ عبارت درج ہے ۔

"جو شخص وید اور عابد لوگوں کی تصنیف شدہ کتابوں کی تحقیر کرتا ہے ۔ اس وید کی مذمت کرنے والے کو ملک سے نکال دینا چاہیئے"

کیا اس مقدس ارشاد کا مطلب سوائے اس کے کچھ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے ۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ انگریز اور مسلمان اپنے صحف سماوی کے مقابلہ میں وید کی تعلیم کو واجب العمل نہیں سمجھتے اور اسے ایک تقویم پارینہ تصور کرتے ہیں ۔

● چونکہ مشرقی ممالک میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص مذہب کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے ۔ اسی وجہ سے ہر بات کی آڑ میں ایک خالص سیاسی نکتہ بیان کیا گیا ہے ستیارتھ پرکاش میں ابتدا سے انتہا تک اسی طریق بیان کو محفوظ رکھا گیا ہے ۔ قانون رائج الوقت کے استحقار و استخفاف کی تلقین اور اس کی خلاف ورزی کی تعلیم ذیل کے الفاظ میں دی گئی ہے ۔

"رگ وید، یجروید، سام وید کے عالم اگر تین شخص بھی رکن انجمن ہو کر آئین باندھیں تو اس آئین کا عدول کوئی شخص نہ کرے"

"جاہل ہزاروں، لاکھوں مل کر بھی کوئی آئین باندھیں تو وہ کبھی تسلیم نہیں کی جانی چاہیئے ۔"

لفظ "جاہل" کی تشریح اس سے بعد کی سطور میں ذیل کے الفاظ میں کر دی گئی ہے ۔

"ویدوں کے نہ جاننے والے جو فرائض بتلائیں ان کو کبھی تسلیم نہ کرنا چاہیئے ۔"

کیا یہ الفاظ کسی توضیح کے محتاج ہیں ؟

آریہ سماج کو وجود میں آئے ہوئے بہت وقت ہو چکا ہے ۔ لیکن جارحانہ اقدام کا آغاز اس نے اب کیا ہے ، یہ تاخیر بھی ستیارتھ پرکاش کی تعلیم کے مطابق

عمل میں آتی ہے۔ صفحہ ۱۹۹ پر لکھا ہے۔

"جیسے بگلا تصور باندھے ہوئے مچھلی کے پکڑنے کو تاکتا رہتا ہے ویسے ہی ضروریات کی فراہمی کے لئے غور کیا کرے۔

دولت وغیرہ چیزوں کو اور طاقت کو بڑھا کر دشمن کو فتح کرنے کے لئے شیر کی مانند طاقت کو کام میں لائے اور چیتے کے مانند چھپ کر دشمن کو پکڑے۔ نزدیک آئے ہوئے طاقتور دشمن سے خرگوش کی مانند دور بھاگ جائے اور بعد ازاں ان کو دھوکے میں ڈال کر پکڑے۔

یہی وہ تعلیم ہے جس کے ماتحت آج آریہ سماجی مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ انہوں نے دولت کی فراہمی کے علاوہ وہ چیزیں بھی فراہم کر لی ہیں جن کا مفہوم ستیارتھ پرکاش میں "وغیرہ" کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے انہیں چھریاں اور کلہاڑیاں سمجھ لیجئے یا مالوی جی کے بھٹے کی اینٹیں اور تیزاب کی پچکاریاں اور سنگٹھن کے اسی قسم کے دوسرے حربے خیال کر لیجئے۔

ہندوؤں کو انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف اکسانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل کئے جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ ستیارتھ پرکاش میں لکھا گیا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو جو اس کتاب کے صفحہ ۳۵۹ سے نقل کی جاتی ہے۔

"جب سے غیر ملک کے گوشت خور لوگ اس ملک میں آکر گائے وغیرہ جانوروں کے مارنے والے شراب خوار حکمراں ہوئے ہیں تب سے برابر آریوں کا دکھ بڑھتا جاتا ہے۔"

اگر صرف گوشت خوروں کا ذکر ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ مگر شراب خوار حکمرانوں کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے کہ انگریز اور مسلمان دونوں پر یکساں اشتعال دلایا گیا ہے اگر کوئی سر پھرا کہہ سکتا ہے کہ اس سے صرف

مسلمان مراد ہیں۔ تو ہم اس کی توجہ ذیل کی سطور پر مبذول کرائیں گے

"دیکھو اپنے ملک کے بنے ہوئے جوتے کو دفتر اور کچہری میں جانے دیتے ہیں یہاں کے دیسی جوتے کو نہیں۔ اتنے ہی سے سمجھ لو کہ اپنے ملک کے بنے ہوئے جوتوں کی جس قدر توقیر کرتے ہیں اتنی غیر ملک کے باشندوں کی نہیں کرتے"۔

ان اقتباسات سے ہر وہ شخص جسے مبداء فیاض سے عقل سلیم عطا ہوئی ہے اندازہ کر سکتا ہے کہ آج ہندوؤں کی جس ذہنیت کا ہم رونا رو رہے ہیں اور آج جس فتنہ و فساد نے ملک کو جنگ و جدال کا مرکز بنا دیا ہے وہ سب ستیارتھ پرکاش کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ جو جدوجہد اس وقت آریہ سماج کے چیلوں نے مذہب کے نام پر شروع کی ہے وہ خالص سیاسی جدوجہد ہے اور ان کا نصب العین سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مسلمانوں اور انگریزوں کو ہندوستان سے کلیتہً اور قاطبتہً نکال دیا جائے۔ مسلمانوں کے خلاف جو جو کوششیں ہو رہی ہیں اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے جو جو منصوبے گانٹھے جا رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن اگر ستیارتھ پرکاش کی یہ تعلیم زندہ ہے اور اس سے جو زہریلی ذہنیت پیدا ہوئی وہ قائم رہی تو انگریزوں کو بھی ہندوستان میں اپنی حیات مستعار کے دن امن سے گزارنے نصیب نہ ہوں گے۔

مسلمانوں نے راجپال۔ کالی چرن اور دیوی سرن شرما کے خلاف آواز بلند کی اور وہ کسی حد تک مؤثر بھی ہوئی لیکن جو گالیاں حضور سرور کائنات کو ستیارتھ پرکاش میں دی گئی ہیں ان کے مقابلہ میں ان کی خرافات گویا بے حقیقت ہے۔

اس سب وشتم اور منافرت انگیزی کے خلاف قانونی کارروائی کرنا تو حکومت کا کام ہے لیکن مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ جن لوگوں کے ارادے اسلام اور حلقہ بگوشان اسلام کی نسبت اس قسم کے ہوں اور جنہوں نے ان کے پیغمبرؐ اور جملہ انبیاء کی شان میں ایسی ناپاک گستاخیاں کی ہوں ان سے کسی قسم کا سروکار نہ رکھیں۔

اشاعت گزشتہ کے مقالہ افتتاحیہ میں ہم نے ستیارتھ پرکاش سے چند اقتباسات کا حوالہ دے کر دکھایا تھا کہ آریہ سماج کی تحریک خالصتہ سیاسی ہے جسے مشرق کے طلوع اور مشرقیوں کی ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی مفید سے مفید تحریک بھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ ہم مانتے ہیں کہ اپنے پیرووں کو اخوت، یکجہتی اور امن کی تلقین کرنا ہر مذہب کے اغراض میں داخل ہے لیکن آریہ سماج کا خمیر ہی منافرت و معاندت سے اٹھایا گیا ہے اور اس کا نصب العین ہی یہی ہے کہ ہندوؤں کے دلوں میں غیر ہندوؤں کے خلاف نفرت کے جذبات مشتعل کئے جائیں۔ چنانچہ تجربہ کہہ رہا ہے کہ جب سے یہ تحریک وجود میں آئی اس بدنصیب سرزمین کے فرزندوں کو ایک دن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ملک کے امن پر پے بہ پے بجلیاں گریں اور جس ہندوستان کی امنیت کا دنیا بھر میں شہرہ تھا وہ فتنہ و فساد کا گہوارہ بن گیا۔

مذہب کا کام بد امنی یا منافرت پھیلانا نہیں۔ لیکن جہاں اصول اولیہ ہی یہ ہو کہ دیدوں کو نہ ماننے والے یک بینی و دو گوش ملک بدر کر دیئے جائیں۔ جہاں بنائے عقائد اسی امر پر ہو کہ جب تک غیر ملک کے گوشت خور، گائے خور۔ اور شراب خوار حکمران ملک کو خالی نہ کر دیں گے آریوں کا بڑھتا ہوا دکھ کبھی کم نہ ہوگا وہاں سے اگر امن ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے تو کونسا تعجب کا مقام ہے ستیارتھ پرکاش کی یہی تعلیم تھی جس نے اپنے پیروؤں کے دلوں میں اس زہریلے تعصب کا بیج بویا۔ جس کے نتائج اب ظاہر ہو رہے ہیں۔

تمام محققین اس پر متفق ہیں کہ موجودہ بد امنی کی ذمہ دار آریہ سماج کی ہی تعلیم ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ہندوؤں مسلمانوں کی آئے دن کی سر پھٹول پر "ٹائمز آف انڈیا" نے ایک سلسلہ مضامین لکھ کر تمام شورش کا ذمہ دار آریہ سماج کو قرار دیتے ہوئے ذیل کے الفاظ لکھے تھے۔

ایک فرزانہ و نکتہ رس حکومت کے اعضا کے لئے ان خوفناک

فسادات کے اسباب دریافت کر لینا کوئی بڑا مشکل کام نہیں
ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ان فسادات کا اصلی باعث آریہ سماج
کی جنگ جویانہ اور مصاف آرایانہ روش ہے دھرم کا گھونگٹ
منہ پر ڈال کر اس نے اپنا (نیم سیاسی) جال ملک کے کونے کونے
میں پھیلا رکھا ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کی تہ میں اس کی اشتعال
انگیزیاں صاف چھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔

حکومت ہند کی توجہ ان فتنہ انگیزیوں کے سدباب کی طرف مبذول کراتے ہوئے اسی اخبار نے لکھا تھا۔

کیا حکومت انگریزی اپنے بازوؤں میں اس قدر طاقت موجود نہیں
پاتی کہ اس آریہ سماجی تحریک کو دبا دے؟ اگر ہے تو اسے ایک لمحہ
کی تاخیر روا نہ رکھنی چاہیئے ورنہ اور بے شمار جانوں کی خیر نہیں اور
اگر طاقت نہیں ہے تو وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی حکمرانی کا بستر
لپیٹ لے اور اس ملک کا انتظام اس ملک کے باشندوں کے
حوالے کر کے چلتی پھرتی نظر آئے۔

یہ کسی مسلمان کی رائے نہ تھی بلکہ ایک ذمہ دار انگریز کا نہایت مخلصانہ مشورہ تھا لیکن افسوس کہ حکومت نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اگرچہ بصورت موجودہ آریہ سماج کی چشم غضب صرف مسلمانوں پر مبذول ہے۔ لیکن حکومت کو بھی اس کے روز افزوں جنون سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کی نظروں میں اس وقت انگریز اور مسلمان دونوں کھٹک رہے ہیں اور اسے ان دونوں کے وجود سے بھارت ورش کو خالی کرانا مقصود ہے۔ انگریز اس وقت برسر حکومت ہیں اور آریہ سماج کا اصول یہ ہے کہ طاقت ور دشمن سے خرگوش کی طرح دور بھاگ جائیں اور بعد ازاں اس کو دھوکے میں ڈال کر پکڑ لیں۔ وہ موقعہ کے انتظار میں ہے خدانخواستہ ان کو ایسا کوئی موقعہ مل گیا تو ہرگز دریغ نہ کریں گے۔ مسلمان کمزور دشمن ہیں ان کے

مقابلہ میں ستیارتھ پرکاش کی تعلیم کے مطابق خیبر کی مانند طاقت کو کام میں لاتے ہیں اور چیتے کی مانند چھپ کر نہتے مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں اور ان کی سیاسی و اقتصادی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ظلم کا تختہ مشق بنا رہے ہیں۔

ستیارتھ پرکاش کے تیرھویں اور چودھویں باب میں جو زہر قرآن اور دیگر صحائف سماوی کے خلاف اگلا گیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے اور اگرچہ ہر مذہب کے پیروؤں نے دوسروں پر نکتہ چینی کی ہے مگر جس معاندانہ اور دل آزار نکتہ چینی کی بنا ستیارتھ پرکاش نے ڈالی اس کی مثال نہیں ملتی۔ انبیاء و مرسلین تو ایک طرف حضرت رب العزت کی ذات کو بھی نشانہ استہزا اور بد زبانی بنایا گیا ہے اور انبیاء بنی سام کی شان میں سخت سے سخت اور ناپاک سے ناپاک بے ادبی اس ضد اور محض اس ضد کی وجہ سے کی گئی ہے جو کتاب کے لکھنے والے کو ہر غیر ہندی چیز سے ہے۔ ذات باری کی ذات و صفات کے متعلق آریائی اور سامی تصورات میں ایک ازلی تضاد چلا آتا ہے۔ اور یہ تصورات ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہے ہیں۔ آریائی تصور "ہمہ اوست" کے رنگ میں رنگا ہوا ہے بخلاف اس کے سامی تصور میں "ہمہ از وست" کا اصول کار فرما ہے۔ پہلا تصور شرک اور بت پرستی کا سرچشمہ بنا اور دوسرے سے خالص توحید کی نہریں پھوٹیں۔ ستیارتھ پرکاش کا راقم باوجود انتہائی تنگ و دو کے اپنی اصلاحی تحریک کو شرک کی آلائش سے نہ بچا سکا۔ جو آریہ دماغ کو ودیعت ہوئی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ ان تمام پیغمبروں کو جو سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنا جانی دشمن حریف سمجھ کر برا بھلا کہے اور اس سب و شتم کے غلو میں اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھے اس مجنونانہ خرافات کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ستیارتھ پرکاش کے تیرھویں باب کے راقم نے سب سے پہلے توارات کی طرف توجہ کی ہے۔ توراۃ مسلمہ طور پر ایک صحیفہ آسمانی ہے۔ چالیس کروڑ مسلمان اور ساٹھ کروڑ عیسائی اور دنیا بھر کے یہودی اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔ اس لئے تیرھویں باب کے گمراہ پرست مصنف کا فرض تھا کہ خدائے تورات کا مضحکہ اڑائے اور اس کے حق

ہی جامع اور مانع گالیاں تصنیف کر سے۔ ملاحظہ ہو۔

جو خدا بچھڑے کا گوشت کھائے اس کی پرستش کرنے والے گائے بچھڑے وغیرہ جانوروں کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ جس کو کچھ رحم نہ ہو اور گوشت کھانے کے لئے بے چین رہے وہ بجز قصاب کے خدا کہیں ہو سکتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگلی آدمیوں کا ایک گروہ ہوگا اور جو ان کا سردار تھا اس کا نام بائبل نے خدا رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ رحیم اور خدا کے درجہ میں شمار نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ ایک گوشت خور شریر آدمی کی مانند ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کی شان میں یہ ناپاک خرافات لکھ کر دریدہ دہن مصنف ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت لکھتا ہے۔

"ابراہیم بھی ایک سادہ لوح آدمی تھا"

حضرت ابراہیم کے بعد حضرت یعقوب کی باری آتی ہے اور ستیارتھ پرکاش کے زہر میں بجھے ہوئے تیر خدا کے اس برگزیدہ نبی پر یوں برستے ہیں۔

تعجب ہے کہ کسی جھوٹ اور مکر و فریب کی برکت سے اولیا اور پیغمبر بن جاتے ہیں۔ جب ایسے عیسائیوں کے ہادی دین ہوں تو ان کے مذہب میں کیوں نہ گڑبڑ مچے۔

جو کمی حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کو "سادہ لوح" اور "جھوٹا" اور "مکار" اور "فریبی" کہہ کر رہ گئی تھی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نئی نئی گالیاں تصنیف کرنے سے پوری کر دی گئی۔ خدا کے اس اولو العزم صاحب شریعت نبی کی توہین کا آریہ سماجی حق حسب ذیل سفیہانہ خرافات میں پورا کیا گیا ہے۔

اب دیکھئے عیسائیوں کے اعلیٰ ہادی مذہب موسیٰ کی خصلتیں اس کا چال چلن غصے وغیرہ بد صفات سے بھرا ہے۔ وہ انسان کی جان کشی کرنے والا اور چور کی مانند بدکار تھا۔ دروغ گو بھی ضرور ہوگا۔

ہندوستان کی ۴۲ کروڑ آبادی سے ستیارتھ پرکاش کو ایک مقدس اور واجب الاحترام صحیفہ منوانے والوں کا دعوٰی ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں پر نکتہ چینی کرنے میں اس نے سر رشتہ اعتدال ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور صرف وہی لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ جس کو آزادانہ تنقید کا اخلاقی ضابطہ جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن آریہ سماجیوں کو چھوڑ کر جن کا یہ دعوٰی ہے ہم باقی انصاف پسند دنیا سے پوچھتے ہیں کہ حضرت موسٰی جیسے بزرگ پیشوائے مذہب کو جن کی عقیدت کا حلقہ ایک ارب انسانوں کے کان میں پڑا ہوا ہے "بدصفات" "چور" "بدکار" اور "دروغ" قرار دینا کہاں کی آزادانہ تنقید ہے اگر یہی آزادانہ تنقید ہے تو لکھنؤ کی وہ بھٹیاریاں جن کی مغلظ گالیاں جمع کرنے میں خلیل صاحب نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا حق رکھتی ہیں کہ ان کی مغلظات کو بھی ایک مقدس صحیفہ تسلیم کیا جائے۔ جو تعزیرات ہند کی گرفت سے بالا ہو۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ خدائے قدوس کے اس جلیل الشان نبی کو جسے طور سینا پر اپنے پروردگار سے مکالمہ کا شرف حاصل ہوا جس کا نام سنتے ہی ساری مسیحی دنیا، ساری موسوی دنیا اور ساری اسلامی دنیا کا سر ارادت فرط احترام سے جھک جاتا ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے تیرھویں باب کے منہ پھٹ مصنف نے "بدصفات" اور "بدکار" اور "چور" اور "جھوٹا" کہہ کر آریائی تہذیب، آریائی شرافت اور آریائی اخلاق کی کیسی بھونڈی اور گھناؤنی تصویر کھینچی ہے۔ خیال ہو سکتا تھا کہ اس سے زیادہ خوفناک توہین کے لئے آریہ سماجی قلم کو بھی باوجود اس قدرت کے جو اسے فحش گوئی پر حاصل ہے کوئی اور اصطلاح نصیب نہ ہو سکے گی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ جناب مسیح اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ اقدس میں تیرھویں باب کے گندہ ذہن مصنف نے دل کے روح کو لرزا دینے والے اور خون کو کھولا دینے والے فقرے لکھ کر اپنی ناپاک فطرت کا راز عالم آشکار کر دیا۔

دھیان ہو موسیٰ پیغمبر اور دھن ہے تمہارا خدا کہ جو عورت، بچے لڑکے اور جانور وغیرہ کی جان لینے سے بھی باز نہیں رہتا۔ اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ زناکار تھا۔ کیونکہ اگر زناکار نہ ہوتا تو
باکرہ یعنی کنواری لڑکیوں کو اپنے لئے کیوں منگواتا اور ایسی بے رحمی
اور زناکاری کا حکم کیوں دیتا۔

ہمارا قلم ان الفاظ کو نقل کرتے ہوئے لرزتا ہے، ہماری آنکھوں میں اس عبارت
کو دیکھ کر خون اتر آتا ہے اور ہمارے پاس الفاظ کا کوئی ایسا ذخیرہ موجود نہیں
جس کی مدد سے ہم غصہ و غم اور غیظ و غضب کے ان جذبات کا اظہار کر سکیں۔ جن کا
ایک طوفان ہمارے دل اور دماغ میں موجزن ہے اور ہم حیران ہیں کہ خدائے
قہار کی غیرت کا پیمانہ ہنوز کیوں نہیں چھلکا۔ آسمان آریہ سماج کے سر پر کیوں نہیں
ٹوٹ پڑا اور زمین ستیارتھ پرکاش اور اس کے ماننے والوں کو نگل جانے کے لئے
کیوں نہیں پھٹ گئی۔

حضرت موسیٰ کی شان میں اس قسم کی خرافات لکھنے کے بعد یہی یاوہ گو اور دریدہ
دہن مصنف حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کی شان میں وہ گستاخی کرتا ہے۔ جس کی
پاداش میں یہودیوں پر ابدی ذلت کی مہر لگادی گئی۔ ان کی سلطنت ہمیشہ کے لئے
چھین لی گئی اور وہ دنیا میں بے خانماں کردئے گئے اس صدیقہ کے متعلق جس کی عفت و
عصمت کی شہادت خدائے تعالیٰ نے دی ہے اور جس کی پاک دامنی کی قسم سراپا دیگیان
جلال کھاتے ہیں۔ ستیارتھ پرکاش کے اسی تیرھویں باب میں جسے خرافات کا مجموعہ اور
ہزلیات کا مرقع کہنا زیادہ موزوں ہوگا لکھا ہے۔

اس طرح تو جس باکرہ کو حمل ٹھہر جائے اس کی بابت یہ کہہ سکتے ہیں
کہ یہ حمل خدا کی طرف سے ہے۔ ایسی ایسی باتوں کو آنکھ کے اندھے
گانٹھ کے پورے لوگ مان کر مغالطہ کے دام میں پھنستے ہیں۔ یہ بات
اسی طرح ہوئی ہوگی کہ کسی آدمی کے ساتھ صحبت کرنے سے مریم
حاملہ ہوگئی ہوگی۔ اس نے یا کسی دوسرے نے ایسی ناممکن بات مشہور
کردی کہ اس کا حمل روح القدس کی طرف سے ہے۔

مریم صدیقہ چالیس کروڑ فرزندانِ توحید اور ساٹھ کروڑ عیسائیت کے پرستاروں کے نزدیک واجب الاحترام ہیں۔ ان پر ایسا ناپاک اور شرمناک بہتان باندھنا اور اعزاز نسوانی کے احترام کو قطعاً نظر انداز کر دینا آریائی تہذیب کے علمبرداروں کا ہی حصہ ہے اور اسی سے ان کے اخلاق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خبث باطن، بیاوہ گوئی اور بد اخلاقی کا اس سے بدتر مظاہرہ اور کیا ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ اس گستاخی کی پاداش میں آج سے دو ہزار سال پیشتر جو سلوک یہودیوں سے ہوا تھا وہی سلوک یا اس سے بھی بدتر سلوک کارکنان قضاء وقدر کی طرف سے آریہ سماج کے ساتھ ہو گا۔

کیا دنیا کے ایک ارب انسانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل کرنے کے لئے ایک ایسی ہستی کی شان میں جسے دنیا بھر کے مسلمان اور عیسائی بنظر تقدیس و احترام دیکھتے ہیں۔ ایسی گستاخی کرنا کسی امن پسند یا صحیح الدماغ انسان کا کام ہو سکتا ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام پر زہر چکانی کرنے کے بعد منہ پھٹ مصنف حضرت عیسیٰ کے ہتک ناموس پر متوجہ ہوتا ہے اور خدا کے اس برگزیدہ نبی کی شان میں جسے ذات باری نے روح اللہ کے مقدس نام سے یاد فرمایا ہے۔ ذیل کے ناپاک الفاظ لکھ کر اپنے خبث باطن کا ثبوت دیتا ہے۔

عیسیٰ نے توریت کے دس احکام میں سے اس حکم کو کہ اولاد اپنے والدین کی خدمت اور عزت کرے جس سے ان کی عمر بڑھے توڑا کیونکہ عیسیٰ نے اپنے والدین کی خدمت نہیں کی بلکہ دوسروں کو بھی والدین کی خدمت سے باز رکھا اسی گناہ کے بدلے درازئ عمر کو نہ پہنچا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ عیسیٰ نے مچھلی کی مانند آدمی کو پھنسانے کے لئے ایک مذہب کا جال پھیلایا تاکہ ان کو پھنسا کر اپنا مطلب پورا کیا جائے۔

کیا ایک اولوالعزم اور صاحب شریعت نبی کے خلاف اس سے زیادہ شرمناک اتہام اور اس سے بڑھ کر ناپاک افترا ہو سکتا ہے؟ عیسائیوں اور مسلمانوں کے

نقطۂ خیال سے تو یہ ممکن نہیں لیکن تیرھویں باب کے مصنف کے نقطۂ خیال سے اس سوال کا جو جواب مل سکتا ہے اسے سمجھنے کے لئے ذیل کے اقتباسات پڑھئے۔

جب یسوع پھوٹ کرانے اور لڑانے کو آیا تھا وہی آج کل جھگڑا لوگوں میں چل رہا ہے۔ یہ یسوع ہی کا کام ہوگا کہ گھر کے لوگوں کا دشمن گھر کے لوگوں کو بنایا جائے۔ شریف آدمیوں کا یہ کام نہیں۔

ایک ایسے برگزیدہ شخص کو جس کی ذات میں دنیا بھر کے عیسائیوں کو الوہیت کا جلوہ نظر آتا ہو اور جسے مسلمان ایک مقدس پیغمبر سمجھتے ہوں منبع فتنہ و فساد قرار دینا اور غیر شریف کہنا اسی شخص کا کام ہے جسے تہذیب و شرافت چھو بھی نہ گئی ہو۔ مصنف کے جہل مرکب، تعصب اور بیہودہ گوئی کا یہیں خاتمہ نہیں ہو جاتا بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

یہ ناممکن باتیں (معجزات) یسوع کی جہالت پر دلالت کرتی ہیں اگر اسے کچھ بھی تمیز ہوتی تو ایسی لچر پوچ اور وحشیانہ باتیں کیوں کہتا۔ سچ ہے جہاں کوئی درخت نہ ہو وہاں ارنڈی کا درخت ہی سب سے اچھا اور بڑا شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے وحشی اور جاہلوں کے ملک میں عیسیٰ کا ہونا بھی غنیمت تھا۔ لیکن آج کل یسوع کس گنتی میں ہے۔

عیسیٰ غصہ ور تھے۔ اسے موسموں کا علم بھی نہ تھا اور اس کی جنگلی آدمیوں کی سی خصلت تھی۔

اگر کوئی گوالا کسی گائے کو مار ڈالے تو بھی طرف داری کر کے گویا مجرم کو بے قصور ٹھہرا کر بری کر دیا جاتا ہے ایسا ہی یسوع کے بہشت میں انصاف ہوگا۔

ستیارتھ پرکاش کے تیرھویں باب میں اس قسم کی ایک آدھ نہیں بیسیوں مثالیں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق موجود ہیں مگر ہم انہیں بخوف اطناب نظر انداز کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور ہر اس شخص سے جسے امن پسند شہری ہونے کا دعویٰ ہے متوقع ہیں کہ وہ ان اقتباسات کو بنظر غائر مطالعہ کر کے فیصلہ کرے کہ کیا اس تعلیم

کی موجودگی میں اور ایسے لٹریچر کے ہوتے ساتے مسلمان اور عیسائی آریہ سماجیوں کے متعلق مسالمت اور رواداری کے جذبات کو اپنے سینوں میں جگہ دے سکتے ہیں اور کیا جن بچوں کے کانوں میں یہی آوازیں بچپن سے پڑ رہی ہوں۔ وہ سن تمیز کو پہنچ کر مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے یا اشتراک عمل کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں؟

جملہ انبیاء مسلمانوں کے نقطۂ خیال سے یکساں عزت و احترام کے مستحق ہیں اور سب کے ناموس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جس قدر انبیائے کرام گزرے ہیں وہ عیسائیوں کی نظروں میں بھی ویسے ہی واجب الاحترام اور قابل عزت ہیں اس لئے عیسائیوں کا فرض ہے کہ وہ ستیارتھ پرکاش کے ان الحاقی ابواب کے متن کتاب سے خارج کئے جانے کے مطالبہ میں مسلمانوں کے ہم نوا ہوں اور ایسا کرنے سے وہ نہ صرف استحفاظ حرمت انبیاء کے فرض سے عہدہ برآ ہوں گے۔ بلکہ ملک کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دیں گے جو محض اس تعلیم کی بدولت فتنہ و فساد اور قتل و سفاکی کا مرکز بنا ہوا ہے۔

پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس کو اس قسم کے یاوہ گویوں اور خرافات نویسوں کے قلم و زبان سے بچانے کا فرض صرف مسلمانوں پر ہے اور اس کے لئے انہیں خواہ کتنی بڑی قربانی کرنا پڑے وہ کسی دوسرے سے استعانت کرنا گوارا نہ کریں گے مگر حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم وعلیٰ نبینا السلام اور مریم صدیقہ علیہا السلام کے خلاف جو دریدہ دہنی کی گئی ہے اسے ستیارتھ پرکاش سے خارج کرانے میں نہ صرف عیسائیوں کو بلکہ ہر مذہب کے عافیت دوست آدمیوں کو مسلمانوں کا ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ شرف انسانیت کی پاسبانی کا انحصار اس پر ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں ارتباط و اتحاد ہو اور وہ سوائے اس کے ممکن نہیں کہ ایسے الفاظ جن سے نفرت و عناد کے جذبات

کو روز افزوں تقویت ہو رہی ہو یک قلم کتاب سے خارج کر دیئے جائیں۔

تیرھویں باب پر تبصرہ ختم ہو گیا۔ چودھویں باب میں آقائے دو جہان حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ بابا نانا ہو دا ہانا کو اس سے کہیں سخت اور ناپاک گالیاں دی گئی ہیں ان کے اعادہ کے تصور سے بھی روح لرز جاتی ہے۔ بس ہمارے لئے ان کا نقل کرنا ممکن نہیں، راجپال، دیدی سرن اور کالی چرن نے جو کچھ لکھا وہ اسی چودھویں باب کی تعلیم کا نتیجہ تھا" ملاپ" اگر آج کہتا ہے کہ اس کے عقیدہ میں عرب سارے فتنہ و فساد کی جڑ ہے تو وہ اسی باب کی تعلیم کا فیضان ہے۔ قارئین کرام کتاب ستیارتھ پرکاش کہیں سے حاصل کر کے خود ہی اس باب کا مطالعہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ کیا اس باب کی موجودگی میں قیام امن ممکن ہے؟ بہر حال حضرت خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس کی حفاظت مسلمانوں کا کام ہے انہیں خود اس کے اسباب و ذرائع پر غور کرنا پڑے گا۔

مگر تیرھویں باب کے متعلق ہم حکومت کو بھی خصوصیت سے توجہ دلانا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ لارڈ ارون جن کا مذہبی شغف مسلم ہے انبیاء بنی سام کی حرمت کے تحفظ کے لئے ضرور مناسب کارروائی کریں گے اور سلطنت انگلستان کے دستور اساسی کے اس پہلے اصول کو پامال نہ ہونے دیں گے کہ " تاجدار انگلستان " ڈیفنڈر آف دی فیتھ " یعنی حامئے دین ہے۔

روزنامہ " زمیندار "
۲۴ر اگست ۱۹۲۷ء

بندہ بیراگی کی عناد آفریں یادگار

من در پے رہائی واو در پے فریب
بر بستہ گرہ زند گرہ نا کشودہ را

پنجاب کے مشہور مہا سبھائی لیڈر بھائی پرمانند جی جن کی حریت پروری عرصہ دراز سے تعصب اور تنگ نظری کے قالب میں ڈھل گئی ہے۔ رات دن اس فکر میں ہلکان ہوتے جاتے ہیں۔ کہ کسی طرح زیر سایہ برطانیہ رام راج قائم کیا جائے اور مسلمان صفحہ ہستی سے بالکل مٹا دیئے جائیں۔ آخر ان کا ذہن لڑ گیا اور انہوں نے ہندوؤں کو یہ دعوت دینی شروع کی۔ کہ وہ اپنے بازوؤں میں وہی شکتی اور کس بل پیدا کریں۔ اور اپنے قلب کو اسی جذبۂ نفرت و عناد کی پوٹ بنالیں۔ جو بندہ بیراگی کو پنجاب کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لئے آج سے دو سو سال پہلے نصیب ہوا تھا۔ اس دعوت کے لئے آپ نے پہلے تو بھائی بندہ بیراگی کے سوانح حیات کتابوں اور رسالوں میں شائع کئے اور جب ہندوؤں کی نگاہ اس طرف متوجہ ہوگئی تو آپ نے زیادہ پاؤں پھیلائے چنانچہ اب آپ نے ارادہ کر لیا ہے کہ بندہ بیراگی کی ایک مستقل اور دیرپا یادگار قائم کی جائے۔ جو ہندوؤں کے اس طبقہ میں جسے آپ کی ہم مشربی کا فخر حاصل ہے مسلمانوں کے خلاف ایک غیر فانی جذبہ بغض و عناد کی پرورش کرتی رہے۔

بھائی پرمانند کا سیاسی بپتسمہ

ہمارے خیال میں اس افتراق انگیزی کی علت العلل بھائی پرمانند کا سیاسی اصطباغ ہے جس کا شرف آپ کو کچھ سالوں سے حاصل ہو چکا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ بھائی پرمانند کسی زمانہ میں اپنی بعض حریت پرورانہ اداؤں کی وجہ سے خداوندان برطانیہ کی نگاہ میں معتوب قرار پا چکے تھے۔ اور آپ نے تاریخ ہند کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ جو حکومت کی برہمی مزاج کا باعث ہوئی۔ اس کے بعد ہی آپ پر تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کی سازش میں شریک ہونے کا الزام لگا اور آپ انڈمان بھیج دیئے گئے۔ لیکن ہر شخص قید و بند کی سختیوں کا حریف نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ باخبر ہیں کہ آپ انڈمان کی صبر آزما اور تاب گسل کاہشوں سے عہدہ برآنہ ہو سکے اور انہیں آخر برطانیہ کے آستانہ عظمت و جلال پر ناصیہ فرسا ہو کر عفو و درگذر کی بھیک مانگنی پڑی۔ یہ التجا اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ بیس سال تک جو تمہاری قید و بند کی میعاد ہے۔ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لو۔ آپ یہ کڑی شرط مان کر ہندوستان تشریف لائے۔ تو وہ متاع حریت جس کی وجہ سے آپ احرار کی صف میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ انڈمان کے ساحل پر ہی چھوڑتے آئے۔ پھر فرنگ سے آپ نے جو پیمان وفا باندھا تھا۔ اس امر کا مقتضی تھا کہ آپ سیاسیات کو خیرباد کہہ کر گوشہ عافیت میں بیٹھے رہتے۔ مگر یہ کرنے تو آپ کی رہائی کی وجہ سے لوگ آشنا ہو جاتے۔ اس لئے آپ کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ رام راج کا علم بلند کر کے۔ ہندوؤں کو سنگٹھن کی دعوت دی جائے۔ تاکہ ادھر ہندو آپ کو اپنا بہی خواہ اور ہندوؤں کے حقوق کا محافظ سمجھیں اور ادھر برطانیہ جس کے نزدیک اس سے زیادہ اور کیا چیز باعث مسرت ہو سکتی ہے کہ اس سرزمین کے باشندے ہمیشہ باہم دست و گریباں ہیں اور جماعتی فتنہ و فساد کے خرابوں سے ملک کا کوئی گوشہ محفوظ نہ رہے۔ آپ کو

خاص الخاص وابستگان دامن دولت ہمیشہ برطانیہ میں شمار کرے۔

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

غرض بندہ بیراگی کی یادگار قائم کرنے کی افتراق انگیز تحریک دراصل اسی "صحیفہ وفا" کی ایک فصل ہے اور آپ معناً ابھی تک اسی طرح بیس سال کے لئے قید ہیں۔ جس طرح انڈمان میں تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انڈمان میں رہ کر آپ ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور اب آپ کھلے بندوں ہندو دھرم کے نام پر ملک و قوم کی تباہی کے منصوبے گانٹھ سکتے ہیں۔

قوم پرست ہندوؤں کا طریق عمل

میرا خیال تھا کہ بھائی پرمانند جو مسلمانوں کے علاوہ کانگرس بلکہ ہر اس تحریک کی مخالفت پر اپنے انڈمانی عہد کی رو سے مجبور ہیں۔ جس کا مقصد ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر ہو۔ اپنی اس خانہ برانداز تحریک کے آپ ہی رہنما اور آپ ہی متبع ہوں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کی وضع و قماش کے چند ہندو جو مسلک حریت سے کوسوں دور ہیں۔ آپ کا ساتھ دیں گے اور کوئی ذمہ دار ہندو جسے کانگرس کے اغراض و مقاصد سے ذرہ بھر بھی ہمدردی ہو۔ آپ کی اس تحریک کو بنظر استحسان نہ دیکھے گا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ لاہور کے بڑے بڑے ہندو تجار رؤساء، کونسل کے ممبروں، بلکہ بعض ان ہندوؤں نے بھی جو حریت پروری کے مدعی ہیں، نہایت گرمجوشی سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ زر و سیم کی تھیلیوں کے منہ کھل گئے اور دم بھر میں ایک مندر کی صورت میں بندہ بیراگی کی یادگار قائم کرنے کے لئے روپیوں کا انبار لگ گیا۔ اس غرض کے لئے چندہ کے علاوہ زمین بھی دی گئی ہے۔ اور اب یہ قرار پایا ہے کہ ہر سال بندہ بیراگی کا یادگاری میلہ نہایت وسیع پیمانہ پر منایا جائے۔ چنانچہ اس میلے کا اعلان لاہور کے در و دیوار پر نہایت جلی حروف میں پوسٹر چسپاں کر کے کیا گیا ہے۔

بندہ بیراگی کون ہے؟

آخر یہ بندہ بیراگی جس کی یادگار منانے کے لئے ہمارے ہندو بھائی اپنے قلب میں ایک خاص اضطراب محسوس کرتے ہیں، کون ہے۔ کیا وہ سری کرشن کا اوتار ہے؟ یا شری رام چندر کی مورتی۔ کیا وہ گوتم بدھ کی روایات کا زندہ کرنے والا ہے یا وشسشٹ وشوامتر، والمیک، ویاس اور شنکر اچاریہ کی طرح علم و فضل کا متحرک پیکر ہے کیا اس نے کالی داس اور بادھبوتی کی طرح اپنی غیر فانی شاعری سے ہندوستان کے تاج عظمت میں کوئی گوہر تابندہ آویزاں کر دیا ہے۔ یا اشوک اور وکرم آدیتہ کی طرح داد عدل و انصاف دیتا رہا ہے؟ تاریخ کے اوراق اس کا جواب یوں دیں گے۔ کہ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال اور سب سے بڑا قابل فخر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے چند روزہ اقتدار کے دور میں مسلمانوں کی بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا، مسلمان بچوں، بڈھوں اور عورتوں کو تہ تیغ کیا۔ مسلمان حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کروائے، سفید ریش قضاۃ کی داڑھیاں نچوا کر اپنی آتما کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا اور اس قسم کی دوسری وحشیانہ حرکات سے تاریخ پنجاب میں وہ نام چھوڑ گیا۔ جس پر صرف بھائی پرمانند اور ان کی وضع و قماش کے دوسرے لوگ فخر کر سکتے ہیں۔

ہنود سے ایک سوال

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس شخص کی یادگار قائم کرنے سے بھائی پرمانند اور ان مہاسبھائی بزرگوں کا کیا مقصد ہے؟ کیا وہ مقصد یہی تو نہیں کہ ہندوؤں کو اپنے آپ میں وہی اوصاف پیدا کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ جنہوں نے بندہ بیراگی کا نام ایک خاص حلقہ میں مشہور کر دیا۔ کیا اس کا مطلب یہی تو نہیں کہ بندہ کی یادگار منانے والے ہندو مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھیں۔ اور آج نہیں تو کل "رام راج" قائم کرنے کے لئے پنجاب کے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک کریں۔ جو ان کے "ہیرو" نے کیا تھا۔

میں پنجاب کے ذمہ دار ہندوؤں سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا ہندوؤں کے لئے سری رام چندر جی اور سری کرشن جی کی مقدس زندگیوں میں کوئی نمونہ ایسا نہیں جس کا تتبع کیا جا سکے، کیا ہندوستان کی پنج ہزار سالہ تہذیب اپنی برکتوں سے اتنی خالی ہو گئی ہے کہ بڑے بڑے باعظمت راجوں، مہاراجوں، رشیوں، منیوں کو چھوڑ کر بندہ بیراگی جیسے سفاک شخص کی دعوت تقلید دی جا رہی ہے اگر ہندو راستبازی، صداقت اور اطاعت کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں تو سری رام چندر جی کی سیرت موجود ہے اگر کسی خاتون کی شوہر پرستی کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں تو سیتا اور ساوتری جیسی خواتین کی مثالیں تاریخ کے صفحات کو تابناک بنا رہی ہیں اگر وفاداری کی کوئی مثال پیش کرنا ہے تو لچھمن اور بھرت کی زندگی سے بہتر مثال کہاں مل سکتی ہے۔ اگر یہ دکھانا ہے کہ ایک شخص جس کے ساتھ صداقت ہو، موت سے نڈر ہو کر یکہ و تنہا باطل کی کثرت پر فتح یاب ہو سکتا ہے تو ہندوؤں کے سامنے سری کرشن جی کی زندگی پیش کر کے انہیں دعوت اتباع دیجئے۔ ہاں اگر ہندو مسلمانوں کی آویزش کی تاریخ یاد کرانا آپ نہیں بھولنا چاہتے اور آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ بد نصیب سرزمین ہمیشہ فتنہ و فساد کا گہوارہ بنی رہے تو شوق سے بندہ بیراگی کی یادگار منائیے۔ لیکن یاد رکھئے کہ یہ فتنہ اپنے اندر قیامت خیزی کی استعداد رکھتا ہے اور اس چنگاری سے ایک دن ایسا شعلہ جوالہ بلند ہو گا۔ جو اس ملک کو یکسر کرہ نار بنا دے گا۔ آپ مسلمانوں کو اس قسم کی یادگاروں سے جھکانا چاہتے ہیں بھائی پرمانند جی اس خیال خام کو دل سے نکال ڈالئے۔ مسلمان بڑا سر پھرا واقع ہوا ہے اور خدانخواستہ اس کے سر میں بھی اسی قسم کا سودا سما گیا۔ جس سے آپ کا کاسہ سر بھرا ہوا ہے۔ تو پھر ...... میں نوجوان بھارت سبھا کے ارکان کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کراتا ہوں کہ وہ پورے زور سے اس خانہ برانداز تحریک کی مخالفت کر کے پنجاب کو تشتت و افتراق کے خطرہ سے بچا لیں۔ میں پنجاب پراونشل کانگرس کمیٹی کے محترم ارکان سے باادب استدعا کرتا ہوں کہ وہ اپنی پوری قوت اس مہیب فتنہ کے سد باب پر صرف کر دیں۔

روزنامہ "زمیندار"

۲۲ مئی ۱۹۲۹ء

سیواجی کے بعد بندرا

ایک نئے خطرے کے روک تھام کی ابھی سے ضرورت

مرحوم آخرالزمان مبارک بندہ الیست

حکومت کی نسبت عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ برطانیہ کے اس روایتی سائیس کی طرح جس نے گھوڑے کے چوری ہو جانے کے بعد اصطبل کا پھاٹک بند کیا تھا وہ بھی فرقہ وار فسادات کی آگ پر اس وقت آکر پانی ڈالتی ہے۔ جب اس آگ کے شعلے اچھی طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ملک کے امن و امان کے خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر چکتے ہیں۔ اس خیال کی عمومیت میں تھوڑی بہت مبالغہ کی آمیزش تو ضرور ہو سکتی ہے لیکن خود حکومت کو بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس خیال کی کوئی اصلیت نہیں۔

اس وقت تک ہندوستان کے طول و عرض میں بیسیوں خونریز ہنگامے ہو چکے ہیں لیکن کسی ایک ہنگامے کی نسبت بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت کے ارباب بست وکشاد کی مآل اندیشی نے اسے روکنے کے لئے پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔ امن و امان کے برقرار رکھنے والوں نے ہر موقع پر زیادہ سے زیادہ یہی کیا کہ جب دو فریقوں میں سر پھٹول ہو چکی تو ان کی پولیس اور ان کے سپاہی سنگینیں اور بندوقیں لے کر پہنچ گئے اور فساد کو دبا دیا لیکن یہ کبھی نہ کیا کہ ان اسباب کو دریافت کریں جو اس خون چکاں باہم آویزی کا باعث ہوتے تھے۔ اور فتنہ کا

سر نمودار ہونے سے پہلے ہی کچل دیں۔

"ٹائمز آف انڈیا" نے آج سے کئی مہینے پہلے ایک کتاب کے کچھ اقتباسات پیش کئے تھے جو "سنگٹھن کا بگل" کے نام سے لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی تھی اور جس میں اس زہریلے سنگٹھنیے نے جس کا نام سوامی ستیہ دیو ہے، جاتی کو مسلمانوں پر ہلہ بول دینے کا سندیسہ دیا تھا۔ حکومت نے جو "زمیندار" کو صرف اتنی سی خطا پر ضبط کر سکتی ہے کہ اس نے چار ناکردہ گناہ اور نہتے مسلمانوں کے وحشیانہ قتل کو جو مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے "قیامت صغریٰ" سے کیوں تعبیر کیا جو "انقلاب" کے دفتر پر صرف اس قصور پر چھاپہ مار سکتی ہے کہ اس نے چند سنگٹھنی لفنگوں کے ہاتھوں ایک مسلمان خاتون کے بے آبرو ہونے کا واقعہ کیوں شائع کیا۔ آج تک سوامی ستیہ دیو کے خلاف جس نے ڈاکٹر مونجی کی خونیں تعلیم کی اشاعت سے سارے ملک میں فتنہ و فساد کا بیج بو دیا کوئی کارروائی نہ کی۔ حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ آریہ سماجیوں کے ایک خاص طبقہ نے مسلمانوں کی عزیز ترین اور مقدس ترین روایات کی تسفیہ اور تضحیک اور تحقیر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے لیکن باوجودیکہ "ٹائمز آف انڈیا" نے پے در پے مطالبہ کیا ہے اور اس مطالبہ میں ہندوستان کے سارے مسلمان متفقہ طور پر شریک ہیں کہ ایک تحقیقاتی ہیئت مقرر کیا جائے جو فسادات کے اسباب کی چھان بین کے سلسلہ میں اس مفسد جماعت کی قابل اعتراض سرگرمیوں پر بھی نظر انتقاد ڈالے، لیکن بظاہر حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

حکومت جس کے محکمہ سراغرسانی کا جال ملک کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے اس حقیقت سے ناواقف نہ ہو سکتی تھی کہ سوراج کے حصول کی خاطر سات کروڑ مسلمانوں کی امداد سے علی الاعلان بے نیاز ہو جانے والے مالویوں اور مونجیوں نے جاتی کو اس سوراج کا اہل بنانے کے لئے جہاں اور بہت سے نئے نئے حربے ایجاد کئے ہیں۔ وہاں اسے یہ گر بھی سکھایا ہے کہ اپنے میں وہی صفات پیدا کرے جو سپاہی

اور پرتاپ اور بندہ میں موجود تھیں۔ یعنی جس طرح عہد قدیم کے ان "مہا پرشوں" نے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور اسلام کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سبھی جتن کئے اسی طرح تم بھی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو جاؤ۔ سیوا جی کی سہ صد سالہ برسی کی اہمیت کا فشا حکومت کی نگاہوں سے، اگر اس میں تدبیر و فراست کا کچھ بھی مادہ ہے، اوجھل نہ ہو سکتا تھا۔ اس برسی کو تو شاید وہ روکنا چاہتی بھی تو نہ روک سکتی کیونکہ سنگھٹنی آج کل بڑے زوروں پر ہیں اور اپنی کاٹیں کاٹیں سے اس کے کان کے پردے پھاڑ سکتے ہیں اور یہی وہ تکلیف ہے جو اس سے برداشت نہیں ہو سکتی لیکن وہ یہ تو کر سکتی تھی کہ ہر اس مقام پر جہاں یہ منحوس برسی منائی جاتی۔ پہلے سے پولیس کا زبردست پہرہ لگا دیتی تاکہ فساد کے امکانات اگر بالکل ہی سلب نہ ہو جائیں تو ناقابل التفات ضرور رہ جائیں مگر اس نے یہ بھی نہ کیا اور اس نے دیکھ لیا کہ اس کی عاقبت ناشناسی اور تساہل سے کیسے کیسے خوفناک نتائج پیدا ہو کر رہے۔

سیوا جی کی برسی تو منائی جا چکی اور کئی مقامات پر اپنی بھینٹ بھی لے چکی۔ اب بندہ کی برسی سر پر آ کھڑی ہے۔ اور ایک اور آفت دوسرے صوبوں پر تو نہیں لیکن پنجاب کے سر پر ضرور منڈلا رہی ہے۔ کیونکہ آریہ سماجی سنگھٹنیوں کے نزدیک پنجاب کی تاریخ میں اگر کوئی شخص ایسا ہو گزرا ہے جس کے "اسوہ حسنہ" کی تقلید انہیں کرنی چاہیئے اور جس کی زندگی کے کارنامے ان کے لئے وجہ اتباع ہونے چاہئیں تو وہ بندہ ہے۔ جس نے پنجاب پر انگریزوں کے مسلط ہونے سے پہلے ہی چند روزہ کامیابی کے دوران میں مسلمانوں کے خاندان کے خاندان تباہ کر ڈالے ان کے گھروں کو آگ لگا دی ان کی حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے ان کے بڑے بوڑھوں کو الٹی چھری سے ذبح کیا ان کے بچوں کو اچھال اچھال کر تلواروں سے چھید ڈالا۔ اب اسی ملعون بندہ کی برسی جون کے پہلے ہفتہ میں منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ امرتسر میں جب سیوا جی کی تصویر کا جلوس نکالنے سے پولیس نے مقامی سنگھٹنیوں کو روکا تو انہوں نے ایک جلسہ کر کے اعلان

کیا کہ ہم بندہ کا جلوس نکال کر اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گے اور حکومت کا قانون توڑیں گے۔

اگر حکومت چاہتی ہے کہ پنجاب ایک اور خونریز ہنگامے سے بچ جائے تو اس کا فرض ہے کہ ابھی سے اس آنے والے خطرہ کی روک تھام پر متوجہ ہو جائے اور اگر سیلاجی کی برسی کی طرح وہ بندہ کی برسی کی اجازت بھی سکھ ٹینیوں کو دے کر اپنی "مذہبی رواداری" کا بھرم قائم رکھنا چاہتی ہے تو اسے اس بات کا انتظام پہلے سے کر رکھنا چاہیئے کہ اس منحوس تہوار کے دن کو سکھٹینیے کوئی مذبوحی حرکت نہ کرنے پائیں ؂

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

روزنامہ "زمیندار"
۱۸ مئی ۱۹۲۷ء

مسلمانوں کی آبرو

سنگٹھنی عمّال حکومت کے رحم پر

۲۵ر جنوری کی اشاعت میں "تحصیل دار نکودر اور گورنمنٹ ہائی سکول" کے عنوان سے ایک ذیلی مقالہ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اور انہیں یاد ہوگا کہ موضع پرچیاں کلاں تحصیل نکودر کی ایک خاتون اپنے خوہر کے پاس مشرقی افریقیہ جانا چاہتی تھیں۔ جب انہوں نے پروانہ راہداری کے عطیہ کی درخواست تحصیل دار کے سامنے پیش کی تو اس نے سینکڑوں من گھڑت اعتراضات کے طومار باندھ دیئے اور اپنی ساری قانون دانی کا سرمایہ جو شاید مدت ہائے مدید سے بیکار پڑا تھا۔ اس ضعیفہ کی درخواست کے رد کرنے پر صرف کر دیا۔ آخر دو دن تک حیران و سرگردان رکھ کر تحصیل کے مسلخوال لالہ سنگت رائے نے سائلہ کو نہایت غیر مہذب الفاظ میں اپنے آقا کا یہ نادر حکم سنایا کہ اگر پروانہ راہداری تصدیق ہی کرانا ہے تو گورنمنٹ ہائی سکول کے بورڈنگ ہاؤس کے لئے بائیں ہاتھ سے میز پر دس روپیہ چہرہ شاہی رکھ دو ورنہ چلتی پھرتی نظر آؤ۔ اس عفیفہ نے تحصیلدار اور مسلخوال کے اس دوگونہ جلال سے مرعوب ہو کر رقم مطلوبہ پیش کر دی اور دل ہی دل میں انگریزی سرکار کو اس ظلم پر کوستی ہوئی کچہری سے رخصت ہوئی۔

ہمارا مقصد مقالہ زیر نظر کے سپرد قلم کرنے سے اس بات کا دریافت کرنا تھا کہ لالہ جگجیت رائے تحصیلدار نکودر نے تصدیق پروانہ راہداری کے لئے دس روپیہ کا انوکھا تعلیمی ٹیکس حکومت کے منشاء سے وصول کیا اور ایسا کوئی حکم افسران بالا دست نے

جاری کر رکھا ہے یا اس ولیس سہا یک اور بال رکھشک بزرگ نے سر رشتہ تعلیم کو زیر بار احسان کرنے کے لئے خود اپنی مرضی سے یہ نیا محصول رعایا پر لگا دیا ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ حکومت اس اہم معاملہ پر فوری توجہ مبذول کرتی اور تحقیقات کے بعد الزام کے ثابت ہو جانے کی صورت میں جہاں تحصیل دار کے خلاف مناسب کارروائی کرتی وہاں ایک اعلان بھی اس مضمون کا شائع کر دیتی کہ اس نے کسی سرکاری مدرسے کے دار الاقامہ کے لئے مسافروں کے پروانہ راہداری پر کوئی محصول نہیں لگایا تاکہ نکودر کے تحصیلدار کی طرح دوسرے سر پھرے عمال کو اس قسم کے استحصال بالجبر کی جرأت آئندہ کے لئے نہ ہوتی اور حکومت بھی بدنامی سے بچ جاتی۔ لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے حکومت نے اس باب میں کوئی موثر تدبیر اختیار نہیں کی۔

آج ہمیں بغداد سے مظلوم خاتون کے داماد محمد ابراہیم صاحب نقشہ نویس کی ایک درخواست کی نقل موصول ہوئی ہے جو انہوں نے جالندھر کے ڈپٹی کمشنر کے نام براہ راست بھیجی ہے۔ اس درخواست میں انہوں نے یہ پرانی داستان پھر تازہ کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنی ساس کو پروانۂ راہداری دلانے کے لئے تحصیل دار نکودر کی کچہری میں خود گئے تھے اور دس روپیہ کی رقم اپنی جیب سے ادا کی تھی جس کی رسید ان کے پاس موجود ہے۔ محمد ابراہیم صاحب نے ساتھ ہی اس توہین آمیز سلوک کا نقشہ بھی کھینچا ہے جو تحصیلدار اور اس کے پیش کار لالہ سنگت رائے نے ان کے ساتھ روا رکھا اور آخر میں استدعا کی ہے کہ جو رقم ان سے جبراً وصول کی گئی تھی وہ انہیں واپس دلائی جائے اور اس نواح کی غریب مسلمان آبادی کو سنگت رائے کے متعصبانہ سنگھٹنی رویہ سے نجات دلائی جائے۔

سکار پرداز ان تحصیل نکودر کی ان جابرانہ چیرہ دستیوں کے شکوہ سنج ایک فقط محمد ابراہیم صاحب ہی نہیں ہیں بلکہ جس طرف کان لگاؤ ان کوتاہ آستین لالاؤں کی دراز دستیوں کا رونا سننے میں آتا ہے۔ بغداد ہی سے ایک اور نکودری بزرگ جن کا نام ولی محمد گوہر ہے اور جو عراق کے محکمہ تحقیقات زرعی میں ایک معزز عہدہ پر

مامور ہیں ایک مراسلہ ارسال فرماتے ہیں۔ اس میں آپ نے نہایت تفصیل کے ساتھ لالہ سنگت رائے کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے لالہ گجپت رائے کا ذکر تو اب فضول ہے کیونکہ وہ پنشن پا چکے اور اب خدا ہی سے اپنے کئے کا بدلہ پائیں گے لیکن سنگت رائے صاحب ابھی تک پیشکاری کے منصب پر مسلمان رعایا کو ستانے کے لئے ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ لالہ صاحب نکودر ہی کے رہنے والے ہیں اور ان کی برادری کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ان کے ایک عزیز نکودر کے ذیلدار ہیں ایک وکیل ہیں، کئی ایک وکیلوں کے ایجنٹ ہیں، متعدد رشتہ دار دوسرے سررشتوں میں چھوٹی بڑی اسامیوں پر قابض ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد ان کے بھائی بندوں کی مہاجنی لین دین کرتی ہے۔ جس کے صدقہ میں مقروض مسلمانوں پر ان کا ناجائز رعب چھایا ہوا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ لالہ صاحب ایک نہایت ہی زہریلے سنگٹھنسٹ واقع ہوئے ہیں اور اس درجہ ترش رو اور بد اخلاق ہیں کہ اس علاقہ کا کوئی مسلمان خواہ وہ کیسا ہی شریف اور معزز کیوں نہ ہو ان کے ہاتھوں رسوا ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ محمد ابراہیم صاحب اور ان کی ساس کے ساتھ جو سلوک ان لالہ جی نے کیا اس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اب اس ذلت کا قصہ بھی سن لیجئے جو مسٹر ولی محمد گوہر کو ان کے اور ان کے بالادست افسر کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔

ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء میں مسٹر گوہر بغداد سے اپنے عیال کو لینے وطن آئے۔ اور ہائی کمشنر عراق نے حکومت پنجاب کو رسمی طور پر ان کے اس ارادہ سے اطلاع دے دی۔ اپنی بی بی کے لئے باضابطہ پروانہ راہداری لینے کو آپ لالہ گجپت رائے کی کچہری میں پہنچے۔ لالہ صاحب نے آپ کی درخواست پیش ہونے پر جس وحشیانہ بدتمیزی کا مظاہرہ کیا اس پر نفرت و حقارت کا اظہار کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہیں۔ اس بات کے جاننے کے باوجود کہ مسٹر گوہر کی بی بی ایک پردہ نشین خاتون ہیں۔ اس سر پھرے سنگٹھنسٹ نے چھوٹتے ہی کہا کہ جب تک میں اس عورت کا چہرہ نہ دیکھ لوں پروانہ راہداری کی تصدیق نہیں کر سکتا مسٹر گوہر کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط کر گئے اور با ادب عرض کیا کہ جناب لالہ صاحب قانون راہداری کی فلاں دفعہ کی فلاں شق کے مطابق پردہ نشین

بی بیاں چہرہ نمائی کی قید سے مستثنےٰ قرار دی گئی ہیں۔ مگر لالہ گجپت رائے کو سنگھٹنی ہونے کے ساتھ رعب حکومت کا بھی گھمنڈ تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ کر بولے کہ میں تو اس کا گھونگٹ الٹ کر اس کی صورت ضرور ہی دیکھوں گا اور اس سے باتیں بھی ضرور کروں گا ورنہ ہرگز پروانہ نہ دوں گا۔ یہ کہہ کر کاغذات زمین پر دے پٹکے اور گجپت رائے سے منسارام بن کر منہ پھیر لیا۔

پاس ہی لالہ سنگت رائے مسلوں کا ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ گجپت رائے اگر منسارام تھے تو یہ منسارام کی ڈگڈگی تھے۔ جھٹ بول اٹھے کہ حضور یہ عورت ارائیں ہے کہیں ارائیں بھی پردہ نشین ہوا کرتی ہیں۔ مسلمانوں کے ایک شریف طبقہ کی یہ ایسی خوفناک توہین تھی کہ لالہ گجپت رائے کا چھپا ہوا بھارت بھوشن بھی چونک اٹھا اور اپنے پٹھو کو دخل در معقولات دینے سے روک دیا۔

یہ تو مسٹر ولی محمد گوہر نے نہیں بتایا کہ ان کی مشکل بالآخر کس طرح حل ہوئی اور پروانہ راہداری انہوں نے کیونکر حاصل کیا لیکن کسی نہ کسی ڈھب سے وہ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر بغداد پہنچ ہی گئے جہاں سے انہوں نے محمد ابراہیم صاحب کی طرح ایک شکایتی درخواست ڈپٹی کمشنر صاحب جالندھر کے نام بھیج دی اور اس کی ایک نقل اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

معاملہ اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ حکومت کو فوراً مداخلت کر کے گجپت رائے کا نکودر سے کسی ایسی جگہ تبادلہ کر دینا چاہیئے۔ جس کا ماحول اس کی ماؤف ذہنیت کا رد عمل کر سکے۔ سنا گیا ہے کہ اس کے تبادلہ کا سوال پچھلے دنوں زیر غور تھا لیکن گجپت رائے کے جانشین پر اس نے کچھ ایسے ڈورے ڈالے کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں پڑ گیا۔ لیکن اگر حکومت پنجاب کو نکودر کے مسلمانوں کے ناموس کا کچھ بھی پاس ہے تو اسے ڈپٹی کمشنر جالندھر کے نام اس اہلکار کے تبادلہ کی ہدایات لطیفہ اشد ضروری بلاتاخیر مزید جاری کر دینی چاہئیں۔

روزنامہ "زمیندار"

١٦ر اپریل ١٩٣٧ء

امرتسر میں رام نومی کا جلوس

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

لالہ لاجپت رائے نے ۱۳ اپریل کی شام کو کلکتہ میں سنگٹھن اور شدھی پر اظہار خیالات کرتے ہوئے ہندوستان کے خرمنِ امن و امان میں جو چنگاریاں ڈالیں ان کی بہار قارئین کرام کسی گذشتہ اشاعت کے بہرہ برقیات میں دیکھ چکے ہوں گے لالہ جی نے لگی لپٹی رکھے بغیر بھرے جلسہ میں اعلان کر دیا کہ ہندو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مسلمانوں سے اگر جنگ نہ کریں گے۔ تو صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے اور ان حقوق کو پامال ہوتے دیکھ کر اگر خاموش رہیں گے تو ان کا شمار نپنسکوں میں ہوگا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا آپ کاٹنے والے ہوں گے۔ ان کا حق ہے کہ مسلمانوں کو شدھ کریں اور اگر مسلمان مزاحم ہوں تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ بقول معاصر "پرتاپ" "لالہ جی نے ایسی زبردست تقریر بہت کم کی ہوگی" اور اس میں انہوں نے "ایسی صاف گوئی سے کام لیا کہ کلکتہ کے مسلمان عمر بھر یاد رکھیں گے"

لالہ جی نے حاقی کے سامنے اپنے دل کو چیر کر رکھتے ہوئے یہ ہنگامہ خیز فقرہ بھی ارشاد فرمایا کہ "اگر حقوق کا مطالبہ اور اس مطالبہ پر اصرار کرنا جنگجوئی ہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ میں جنگجو ہوں"۔ زمانہ کے اس مہیم فرقت کے اس ارجن نے ایک حق کی تصریح تو پوری شد و مد سے کر دی کہ مسلمانوں کو مرتد کرنے میں اگر لاٹھیوں اور

اینٹوں اور تیزاب کی پچکاریوں اور بموں کی ضرورت آپڑے تو ان حربوں کے استعمال سے جاتی کے مہابیروں کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ دوسرا بڑا حق جس کی حفاظت کے بغیر بھارت کے اس نیلے آسمان کے نیچے سنگھٹن کی آبرو سلامت نہیں رہ سکتی، اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مسلمانوں کی مسجدوں کے سامنے ڈھول پیٹنا اور سنکھ بجانا اور شور مچانا اور جلوسوں میں مسلمانوں کے بزرگوں کو گالیاں سنانا ہے۔ اس مقدس حق کی توضیح پر لالہ جی نے اپنا زور کلام صرف نہ فرمایا۔ جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ راولپنڈی سے لے کر مدراس تک اور لاڑکانہ سے لے کر بارلیسال تک ساری ہندو دنیا اس حق کا مطالبہ پوری شکتی کے ساتھ کرنے میں پہلے ہی سے مصروف ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ناسور ڈالے جا رہے ہیں ان کے سر پھوڑے جا رہے ہیں، ان کو قید کرایا جا رہا ہے، ان پر مقدمے چلوائے جا رہے ہیں۔

لالہ جی خوش ہوں کہ جس تعلیم کی مشعل ہاتھ میں لے کر وہ چند سال سے ملک میں دورہ لگا رہے ہیں اس کی روشنی اب گھر گھر پھیل چلی ہے۔ امرتسر میں جو کچھ یوم شردھانند پر ہوا اور جس کا اعادہ رام نومی کی تقریب پر کیا گیا وہ ان کے دل میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑا دے گا۔

قارئین بھولے نہ ہوں گے کہ جس دن امرتسر کے ہندوؤں نے شردھانند کے قتل کی یاد میں ایک جلوس نکالا تھا۔ تو فرمینٹ کاوہ تراشیدہ جذبہ جسے مالوی جی اور لاجپت رائے جی اور مونجے جی کی گود میں پرورش پاتے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں کس انوکھی شان سے کرشمہ سنج ہوا تھا مسلمانوں کے آقا و مولا (علیہ الف الف تحیات) کی یاد اقدس پر کیسے کیسے سوقیانہ آوازے کسے گئے تھے۔ سلاطین اسلام پر ناپاک سے ناپاک اتہامات لگا کر مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ کس بری طرح چھلکایا گیا تھا۔ مسلمانوں کی تہذیب کا منہ چڑا چڑا کر مسخرگی کے کیسے کیسے ہنوماتی جوہر دکھائے گئے تھے مسلمانوں نے یہ سب کچھ دیکھا اور سنا مگر خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو گئے۔ حکومت

نے بھی جسے رعایا کے ہر طبقہ کو ایک آنکھ سے دیکھنے کا ادعا ہے یہ سب کچھ دیکھا مگر نہ تو سنگھٹنیوں کی بازاری گالیوں سے لائسنس مانگنے کی ضرورت سمجھی، نہ ان جگر خراش طعنوں پر آئندہ ہی کے لئے وہ واحد العینی امپیریل پابندی عاید کرنی مناسب خیال کی جس کا شور سنتے سنتے ہمارے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں۔ اسے اپنے اس فرض منصبی کا احساس ہوا تو اس وقت جب کہ مجلس خلافت امرتسر نے باریسال کے کشتگان جفا کی یاد میں اپنے غم و الم کے مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اب امن و امان اور صلح و سلام کے سفید فام اجارہ داروں کے قانون کی تمام قہرمانی قوتیں اپنے پورے طنطنہ و تمکنت کے ساتھ فعل میں آگئیں اور مقامی پولیس نے احکام جاری کر دیئے کہ مسلمانوں کو اگر باریسال کے شہداء کی یاد ایسا ہی بیکل کر رہی ہے کہ وہ جلوس نکالے بغیر نہیں رہ سکتے تو انہیں اس کے لئے اول لائسنس حاصل کرنا چاہیئے۔ مجلس خلافت کی اسلامی خودداری کو حکومت کے مقامی عمال کی اس کھلی ہوئی سنگھٹنی نوازی پر پھر خون کا ایک گھونٹ پینا پڑا اور مسجد خیر الدین کی چار دیواری کے اندر ایک عظیم الشان جلسہ میں اپنے بھرے ہوئے دل کا بخار اس یک طرفہ استبداد پر نفرت و حقارت کی ایک قرارداد کی شکل میں نکالنا پڑا۔

مسلمان تو ریزولیوشن پاس کر کے محو سکوت ہو گئے کہ یہاں کی دیرینہ روش ہے لیکن ہنود کا نیا داعیہ عمل لا اچلتی لمے ہیں برستور سرگرم ہستی رہا اور ۱۳ اپریل کو رام نومی کی تقریب پر امرتسر میں ایک نئے جلوس کی تیاریاں ہونے لگیں جس کے لئے گالیوں اور پھبتیوں اور تہمتوں کا پرانا ذخیرہ اسلام کی تواضع کرنے کو جوں کا توں موجود تھا۔ مسجد خیر الدین والا مظاہرہ منجملہ تازہ تھا۔ اس لئے پولیس نے کچھ تو برطانی ضابطہ کے ادعائے غیر جانبداری کی شرم سے، کچھ ستم رسیدہ مسلمانوں کی الٹنگ شنوئی کے خیال سے فیصلہ کر لیا کہ ہنود لائسنس لئے بغیر جلوس نہ نکال سکیں گے۔ اور مسجدوں کے سامنے باجہ نہ بجا سکیں گے۔ لیکن یہ فیصلہ جو مسلمانوں کے لئے قفل مہرم کا حکم رکھتا ہے۔ سنگھٹن کی قہر آلود نگاہوں کی ایک ہی گھرکی میں مہرم سے

متعلق اور معلق سے انقطاع ہو گیا۔ مالوی جی کی وہی رگ گردن جس نے ہر دوار کے پل پر انگریزوں کو جیپ بلا دی تھی اینٹھ کر امرتسر کی پولیس کے سامنے آ گئی اور ہندو کو اجازت دے دی گئی کہ اپنا جلوس لائسنس کے بغیر ہی نکال لیں۔

اس جلوس میں وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ ہمارے ایک محترم نامہ نگار لکھتے ہیں

اس جلوس پر بھی سنگھٹنیوں نے اپنی جدید تعلیم کے مطابق مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک چھڑکا۔ صابونیاں والی مسجد کے سامنے سخت اشتعال انگیز طریقے سے باجہ بجایا۔ مسجد کے دروازہ کے سامنے مسلسل اور متواتر ہر مہابیر ٹولی نے شور و شر بپا کیا۔ مسجد کا دروازہ احتیاطاً فتنہ کے سدباب کے لئے بند کر دیا گیا تھا لیکن ان بپھرے ہوئے سنگھٹنیوں کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے۔ انہوں نے مسجد کے سامنے اس زور سے باجہ بجایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مسلمانوں کی دل آزاری کے لئے طرح طرح کے آوازے کسے گئے۔ ایک نمازی مسجد کا دروازہ بند پا کر گھر کو واپس جا رہا تھا۔ اس کی ٹوپی اتار لی گئی۔ سنگھٹنیوں کے اس بہیمانہ شور کی وجہ سے نمازِ عشاء باجماعت نہ ہو سکی اور مسلمانوں نے گلی کے رستہ سے داخل ہو کر فرداً فرداً نماز ادا کی۔

ہمارے نامہ نگار کو ان مسلمان آنریری مجسٹریٹ صاحب کی دینی غیرت سے الم آمیز شکوہ ہے جو جلوس کے ہمراہ تھے مگر ہندوؤں کی وحشیانہ حرکات پر جو فساد کو دعوت دے رہی تھیں بالکل خاموش رہے اور اپنی آنکھوں سے اسلام کی توہین ہوتی دیکھ کر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ شکوہ عبث ہے۔ آنریری مجسٹریٹ صاحب آخر اسی حکومت کی کل کے ایک پرزے ہیں جس کی باگ سر میلکم ہیلی کے ہاتھ میں تو کہنے کو ہے لیکن دراصل مالوی جی اور لاجپت رائے جی کے ہاتھ میں ہے حکومت نے جان بوجھ کر حقائق حاضرہ کی طرف سے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ مسلمان بڑا صابر ہے۔ بڑا متحمل ہے۔ لیکن اس کے بھی صبر و تحمل کی آخر ایک حد ہے۔ امرتسر میں رام نومی کے موقع پر جو کچھ ہوا ہے اگر وہ ایک بار پھر ہوا تو اس امن و امان کا خدا ہی حافظ ہے جو حکومت کو بے حد عزیز ہو گا۔ مگر اس کی سنگھٹن پرستی کے صدقہ میں کوئی دم کا مہمان نظر آتا ہے۔

روزنامہ "زمیندار" ۱۹ر اپریل ۱۹۲۷ء

عدالتِ عالیہ پنجاب

بتخانہ گہ خانقہش نام کردہ اند

۲۲ر جون ۱۹۲۷ء کو مسلمانانِ لاہور نے حضور آنحضرت دو جہاں کے ناموس پر حملہ کرنے والوں کو دندان شکن جواب دینے کے لئے اپنی آبائی غیرت۔ اپنی روایتی عصبیت اور اپنے سیزدہ صد سالہ وقار کا جو شاندار مظاہرہ کیا اس کی یاد اپنوں اور پرایوں کے دلوں سے مدت ہائے مدید تک محو نہ ہو گی۔ مسلمانان لاہور نے اپنے اس بے مثل اجتماع میں سر پھرے شرانگیزوں کو اور حکومت کے اس ناعاقبت اندیش طبقہ کو جو ان کی نا بوجھی حرکات کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے ہے بتا دیا کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود توحید کے سات کروڑ فرزند جو طول و عرض ہند میں بکھرے ہوئے ہیں اب بھی اس قدر قدرت رکھتے ہیں اور اگر کوئی جماعت ان کے آقا و مولا کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لیں اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اگر اس کی پشت پر ہو تو یا تو اسے مٹا دیں یا خود مٹ جائیں۔ اس جلسہ نے یہ حقیقت بھی الم نشرح کر دی کہ مسلمان راج پالوں اور کرشنوں اور چھوٹیوں اور کالی چرنوں اور دیوی سرنوں کی انتہائی اشتعال انگیزیوں کے باوصف اس وقت تک کہ حکومت کی طرف سے ان بدبختانِ ازلی کی گندہ دہانیوں کو روکنے کی آخری امید باقی ہے۔ صلح و سلام امن و امان اور ضبط و تحمل کا وہ ثبوت دے سکتے ہیں جو اس دنیا میں صرف انہیں کا حصہ ہے۔

لیکن مالوی جی کے لاہوری چیلے چانٹے کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے جلسہ کا انعقاد قیامت سے کم نہیں۔ باغ بیرون دہلی دروازہ میں

ان کی یکجائی رنگ لائے بغیر نہ رہے گی - فساد ہوگا اور ایسا خوفناک فساد ہوگا کہ کم ازکم لاہور کے ہندو محلوں کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی - تمام سنگٹھنی اخبار نویسوں اور ہندو سبھائی لیڈروں نے کئی دن پہلے سے شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ اس جلسہ کی ہرگز اجازت نہ دی جائے ورنہ برا نتائج جانیں کہ لاہور پر کیا آفت ٹوٹ پڑے۔ مقامی حکام جن کے دروازوں کی چوکھٹیں سنگٹھنیوں کے پیہم سجدوں سے گھستے گھستے پاتال تک اتر گئی ہیں - اس واویلا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھے کہ جلسہ روک دیں یا نہ روکیں - چیف جسٹس سر شادی لال اور ان کے ہم نشینوں کی نوکر شاہی جس کی پشتیبان سنگٹھن کی پوری قربانی قوت ہے مشورہ دے رہی تھی کہ جلسہ نہ ہونے دیا جائے ورنہ شوریدہ سر مسلمان جو منہ میں آئے کہیں گے اور وہی گت ہائی کورٹ کے دوسرے ججوں کی بھی بنائیں گے جو "مسلم آوٹ لک" نے کنور دلیپ سنگھ کی بنائی ہے - لیکن برطانوی مصلحتوں کا اصرار تھا کہ ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کے جذبات کا دفعہ ۱۴۴ کے استبدادی پٹارے میں بند کر دینا اس سے بھی بڑی مصیبت ہے جیسے کسی نہ کسی طرح مالنا ہی اولی و انسب ہوگا۔

ادھر خلافت کے رضا کار شہر میں منادی کرتے پھرتے تھے کہ کنور دلیپ سنگھ کے راج پالی فیصلہ اور عدالت عالیہ کے اس جابرانہ فرمان کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے جس نے رسول اللہؐ کے دو غلاموں کو صدائے حق بلند کرنے کی پاداش میں حوالہ زنداں کر دیا ہے سارے کلمہ گو بعد نماز مغرب جمع ہو جائیں - ادھر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی کہ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے جس پر کاربند ہو کر مسلمانوں کو جلسہ بھی کر لینے دیا جائے اور اس بات کی طرف سے بھی اطمینان ہو جائے کہ ان کے ہاتھوں ہندوؤں کے جان و مال اور عدالت عالیہ کی عزت و آبرو پر کوئی مجاہدانہ حملہ نہ ہونے پائے گا۔

ایک بجے کے قریب مجھے مسٹر کیونامقام ڈپٹی کمشنر کی طرف سے پیغام

پہنچا کہ ڈاکٹر اقبال کو ساتھ لے کر مجھ سے کھڑے کھڑے مل جائیے۔ چند اہم امور ہیں آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے نقاہت میں تو نصیب اعدا درد تھا اس لئے وہ تشریف نہ لے جا سکے۔ میں البتہ اس درد کی سفارش پر جو دل و جگر میں چٹکیاں لے رہا تھا کیو صاحب کی مشورت گاہ کی طرف عزیزی اختر علی خاں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ وہاں پہنچا تو شیخ سر عبدالقادر، خان بہادر ملک محمد حسین صدر بلدیہ، میاں امیر الدین نائب صدر بلدیہ، مولوی غلام محی الدین قصوری، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور مولانا غلام مرشد صاحب کو پہلے سے موجود پایا۔ کامل تین گھنٹہ تک جلسہ مجوزہ کے التوا، عدم انعقاد کے انعقاد کے مصالح سگانہ پر سرگرم بحث ہوتی رہی۔ اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس بحث میں حصہ لینے والوں نے مسلمانوں کے حسیات کی ترجمانی کا حق کس طرح ادا کیا۔ اس وقت دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک خاص جماعت باوجود تمام حالات سے واقف ہونے کے اپنے اس دعوے میں جس کی تشہیر ایک خاص انداز کے ساتھ کی جا رہی ہے کہاں تک حق بجانب ہے کہ ۲۴ جون کی رات کو جو قرار دادیں لاہور کے مسلمانوں نے منظور کیں ان کا مسودہ مسٹر کیو نے مرتب کیا تھا۔ یہ سطور اس غرض سے سپرد قلم کی جا رہی ہیں کہ عدالت عالیہ کے باب میں میرے اور مسٹر کیو کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ اس کی کیفیت مسلمانوں پر واضح ہو جائے۔

دوران بحث میں جب جسٹس کنور دلیپ سنگھ کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ انہوں نے اپنے ناشدنی فیصلہ میں اسلامی روایات کے متعلق افسوسناک ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے اور برطانیہ کے امپیریل مصالح کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے مسلخ میں لے دردی سے چوزنگ کیا ہے۔ ساتھ ہی میں نے مسلمانوں کے اس مطالبہ کو حق بجانب ثابت کیا کہ ایک آزاد کمیشن کا تقرر عمل میں آئے جو پنجاب ہائی کورٹ کے مفاسد کی تحقیقات کرے۔ اس پر مسٹر کیو کہنے لگے کہ نقص اگر ہو سکتا ہے تو قانون میں ہو سکتا ہے۔ اس میں جسٹس دلیپ سنگھ یا ہائی کورٹ کی کیا خطا ہے اس کا جواب میں نے

انہیں حسب ذیل الفاظ میں دیا۔

آپ جسٹس دلیپ سنگھ اور عدالت عالیہ کے دوسرے اعضاء کو اس الم ناک صورت حالات کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے جو فیصلہ "رنگیلا رسول" نے پیدا کر دی ہے۔ بلکہ سارے کا سارا الزام قانون وقت کے سر چپک رہے ہیں جو مسلمانوں کے درد کا علاج نہیں ثابت ہو سکا۔ اچھا یوں ہی سہی۔ اب سنئے۔

یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ مسٹر ٹیک چند صاحب جو عدالت ہائے تحتانی میں راج پال کی پرجوش وکالت کا پورا پورا حق ادا کر کے ہندو سبھائی حلقوں میں سنگھٹن کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے ہیں جناب لالہ شادی لال صاحب کی کوششوں سے یک گردش قلم عدالت عالیہ کے مستقل جج بنا دیئے گئے ہیں اور یہ گمان غالب ہے کہ جناب لالہ صاحب کے جانشین ہوں گے۔ یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ عدالت عالیہ کے ارکان میں اکثریت ہندوؤں کی ہو جائے اور اس عدالت کا سارا عملہ ماتحت بھی ہندو ہی ہو۔ یہ وہ قانون ہے جس نے اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ سر عبدالقادر پر جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں "نالائقی" کی علت میں ہمیشہ کے لئے عدالت عالیہ کی رکنیت کا دروازہ بند کر دیا جائے اور سر محمد اقبال کو بھی شاعر ہونے کی پاداش میں قانون دانی سے بے بہرہ اور فیصلہ نویسی کی استعداد سے عاری قرار دے کر اسی سلوک کا مستحق سمجھا جائے یہ وہ قانون ہے جو پنجاب بھر میں کوئی بیرسٹر اور وکیل ایسا نظر نہیں آتا جس میں جناب لالہ شادی لال صاحب کی ہم نشینی کا سلیقہ ہو۔ اور اس لئے وہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے کبھی سید عبدالرؤف کو دعوت دیتا ہے۔ اور کبھی مسٹر آغا حیدر کو یہی وہ خرابیاں ہیں جنہوں نے

اس ہائی کورٹ کو برطانوی ہائی کورٹ کے بجائے ایک اچھی خاصی
ہندو ہائی کورٹ بنا رکھا ہے۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ ہمارے دل میں اس
کی عزت ہو۔ اور ہم اس کی طرف سے اپنے دل میں اعتماد کو جگہ دیں۔
مسلمانوں کا اعتماد تو اس پر سے اٹھ گیا اور اب وہ یقیناً متفقہ طور پر یہ
مطالبہ کریں گے کہ اس کی ہیئت ترکیبی، اس کے نظام اساسی میں سر سے
لے کر پاؤں تک تبدیلی ہونی چاہیئے، جس سے مسلمانوں کے مفاد محفوظ
ہو سکیں۔ خواہ اس مطالبہ کی تکمیل کے لئے انہیں ملک معظم کا دروازہ
ہی کیوں نہ کھٹکھٹانا پڑے کہ وہی اس جنس عدل کے سرمایہ دار ہیں
جو پنجاب کے اندر لالہ شادی لال صاحب کی ترازو میں تل رہی ہے
مسلمان خوب جانتے ہیں کہ ہائی کورٹ کے جج براہ راست ملک معظم
کے ماتحت ہیں اور حکومت ہند یا حکومت پنجاب ان کا کچھ بھی بگاڑ
نہیں سکتی۔ اسی لئے پنجاب ہائی کورٹ حکومت کے شعبہ عاملہ کی تمام
مصلحتوں کی طرف سے بے نیاز ہے، اور جو یہ کہ گورنر سر میلکم ہیلی
تک کو خاطر میں نہیں لاتی، جن کے پیچھے بیٹھنے تو مجھے جھانک کر رہی گئے
ہیں۔ لیکن ہائی کورٹ والے بھی ان کے اس فعل کو شاید اچھی نظروں
سے نہیں دیکھتے کہ کیوں انہوں نے جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے فیصلہ
پر مخالفانہ اظہار رائے کر کے دخل در معقولات دینے کی جرأت کی۔

میرا یہ جواب سن کر مسٹر کیو نے فرمایا کہ حکومت کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں
کے جذبات کو دبائے، آپ کو اختیار ہے کہ ایک عام جلسہ کر کے یہ تمام امور حکومت
کے گوش گزار کر دیں۔ لیکن میں اگر آپ کی جگہ ہوں، تو اس سارے بحث کو جو عدالت عالیہ
کے مسئلے عمومی سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی دوسرے جلسہ پر اٹھا رکھوں۔ میں نے عرض کیا
کہ اس مشورہ کا بہت بہت شکریہ۔ مسلمان اپنے مصالح سے اچھی طرح واقف ہیں۔
جن خیالات کا اظہار میں نے مسٹر کیو کے سامنے کیا تھا۔ وہ پنجاب بلکہ سارے

مسلمانوں کے خیالات ہیں اور وہ دن بھی عنقریب آیا ہی چاہتا ہے جب مسلمانوں کی آواز اپنے پورے جلال کے ساتھ ڈاؤننگ سٹریٹ میں گونجے گی اور روز برہند کو ان کے اس عزم بالجزم سے آگاہ کر دے گی کہ خدائے واحد کے پرستار بتوں کے آگے گردن جھکانے کے لئے نہیں۔ بلکہ ان بتوں اور ان کے حامیتیوں کی گردن اپنے سامنے جھکانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اے مسلماں سجدہ کرنا ہے تو کر اللہ کو
پر کسی حالت میں شادی لال کے آگے نہ جھک

وہ بھی کیا اچھا زمانہ تھا جب قومیت متحدہ کا تصور آج کی طرح کچھ شیخ چلی کا منصوبہ نہ تھا، بلکہ ایک جیتی جاگتی، بولتی چالتی حقیقت تھی جب ملک کے مشترکہ مفاد کے تحفظ کے لئے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی قوت بازو تھے، جب مناصب کی تقسیم میں یہ سوال کہ فلاں عہدہ ہندو کو ملے یا مسلمان کو سیاسیات ہند میں خلل ڈالنے کو موجود نہ تھا۔ عدالت عالیہ پنجاب کی مسند صدارت خالی ہوئی۔ سارا پنجاب پکار اٹھا کہ اس منصب رفیع پر ہندوستانیوں کا حق ہے اور جب ملک کی طرف سے لالہ شادی لال کا نام اس عہدے کے لئے تجویز ہوا تو مسلمانوں نے لالہ شادی لال صاحب کی چوٹی اور جنیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے گویا ہندو مت کے یہ دو نشان دنیا میں موجود ہی نہ تھے، پوری قوت سے ان کی تائید کی اور پنجاب کے متفقہ مطالبہ پر لالہ صاحب چیف جسٹس ہو گئے۔

لیکن مسلمانوں کو یہ کیا خبر تھی کہ زمانہ کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ ہندو کی ذہنیت نے یک بیک پلٹا کھایا اور لالہ صاحب بھی اسی رو میں بہنے لگ گئے۔ جس میں مالوی اور منجے بہ نکلے ہیں۔ مسلمان اگر ساتھ نہ دیتے تو لالہ صاحب حشر تک چیف جسٹس نہ ہو سکتے بلکہ ان کی جگہ آج کوئی انگریز ہوتا۔ لیکن اس احسان کا بدلہ انہوں نے دیا تو یہ دیا کہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کو بے دریغ پامال کرنا شروع کر دیا۔ ان کی احسان فراموشی کی یہ المناک داستان بے حد طویل ہے اور بخوف اطناب ہم ناظرین کرام کو چند صحبتوں میں، اس کے چیدہ چیدہ مقامات سنانے ہی پر اکتفا کریں گے، جن سے

اندازہ کیا جا سکے گا کہ سارا اسلامی پنجاب ان لالہ صاحب کے ہاتھ میں اپنی قسمت کی باگ خود دے دینے کا خمیازہ کس بری طرح کھینچ رہا ہے۔

قبیلہ نوازی اور قوم پروری بڑی اچھی چیز ہے لیکن لالہ شادی لال صاحب کو ہندوؤ قیاس سے یہ جو ہر اس فراوانی کے ساتھ مرحمت ہوا ہے کہ مانیہ منجی جی اور پوجیہ مالوی جی کو بھی اگر ان پر رشک آنے لگے تو ہمیں ذرا تعجب نہ ہو۔ لالہ صاحب کے نزدیک جاتی کی سیوا کا اصل الاصول یہ ہے کہ جہاں تک بن پڑے، سر رشتہ عدالت کا کوئی بڑا عہدہ کسی مسلمان کو نہ ملنے پائے۔ اور اس کے لئے جو پاپڑ بھی بیلنے پڑیں بیلے جائیں۔ مسلمانوں کو نالائق ثابت کیا جائے۔ ذرا ذرا سی خطاؤں پر جن کی پاداش میں ہندوؤں کے لئے صرف چشم نمائی کافی سمجھی جاتی ہے۔ انہیں سخت سے سخت سزا دی جائے۔ بڑے بڑے عہدوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اسامیوں پر بھی تا بحد امکان ہندوؤں ہی کا تقرر عمل میں آئے۔ تاکہ جس حد تک سر رشتہ عدالت کو تعلق ہے پنجاب میں "رام راج" قائم ہو جائے۔

پنجاب اسلامی ہندوستان کی روح ہے۔ مسلمان یہاں نصف سے زیادہ آباد ہیں۔ اس اکثریت کے ساتھ ساتھ ان میں زمانہ کے دوش بدوش چلنے کی قابلیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اور گو دولت میں وہ ہندوؤں کے پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن دماغی قابلیت میں اگر ان سے زیادہ نہیں، تو کم بھی نہیں۔ قانون داں طبقہ میں متعدد ایسے مسلمانوں کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں، جو خود لالہ شادی لال صاحب کو کئی سال تک داد گستری کا سبق پڑھا سکتے ہیں۔ خیال ہو سکتا تھا کہ اس صوبہ کی سب سے بڑی عدالت میں اپنی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ان کا آزاد عنصر اس حیثیت سے موجود ہو گا کہ مسلمانوں کے مفاد کی بوجہ احسن نگہداشت ہو سکے۔ لیکن لالہ شادی لال صاحب کی عنایت سے آج یہ حالت ہے کہ ایک بھی ایسا جج عدالت عالیہ میں نظر نہیں آتا جو صحیح معنوں میں ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کا قائم مقام ہو، اور ان کے اولین حقوق کی پاسبانی کی خدمت کسی طاقت سے دبے، کسی مصلحت سے مرعوب

ہوئے بغیر انجام دے سکے۔ کیا اندھیر ہے کہ رسول اللہ صلعم کے ناموس پر حملہ ہوتا ہے مگر عدالت عالیہ کی کرسی کرسی پر کوئی ایسا مسلمان دکھائی نہیں دیتا جو اس ناموس کے بچانے کے لئے ایک حرف بھی اپنی زبان سے نکال سکے۔

حکومت کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ پنجاب کے مسلمانوں میں سے کسی قابل قانون دان کو عدالت عالیہ کی رکنیت کا منصب تفویض کیا جائے۔ چودھری شہاب الدین صاحب، شیخ عبدالقادر صاحب، اور علامہؒ اقبال پر نظر انتخاب کا یکساں حق تھا۔ دوسرے پنجابی مسلمانوں سے جن کے ناموں کا اس فہرست پر اضافہ ہو سکتا ہے ہم قطع نظر کرتے ہیں، اور صرف انہیں کو لے کر دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اگر منتخب ہوتا تو عدالت عالیہ کی رونق کو چار چاند لگ جاتے لیکن لالہ شادی لال صاحب کے سنگھٹنی ہتھکنڈے ملاحظہ ہوں کہ کس خوبصورتی سے ان پر ہاتھ صاف کر کے اپنے ہندو نوازانہ مصالح کا رستہ صاف کر لیتے ہیں۔ صوبہ کے حاکم اعلیٰ نے جب کہا کہ چودھری شہاب الدین کی قانون دانی مسلم ہے وہ بڑے اچھے جج ثابت ہوں گے تو لالہ شادی لال صاحب نے سوکھا سا منہ بنا کر جواب دیا کہ چودھری صاحب کے قانون دان ہونے میں کلام نہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ بلدیہ لاہور کی صدارت کے زمانہ میں انہوں نے ہندوؤں کے مفاد کو الٹی چھری سے ذبح کیا ہے اگر وہ جج بنا دئے گئے تو کسی ہندو کو ان پر اعتماد نہ ہوگا۔ پس میں کس طرح ایسے شخص کی سفارش کر سکتا ہوں۔ جس کا وجود ہی برطانوی عدل کی روایات ناطرفداری کی ضد ہو۔ شیخ عبدالقادر صاحب کا ذکر آیا تو لالہ جی کی آنکھوں میں اس نالائقی کی تصویر پھر گئی جو سنگھٹنوں کے نزدیک مسلمانان ہند کا طغرائے امتیاز ہے۔ بہت بڑے ناصح مشفق بن کر حکومت کو مشورہ دیا کہ ایسے شخص کو جو فن قانون سے مطلق بے بہرہ ہونے کے ساتھ اس معمولی دماغی قابلیت سے بھی عاری ہے کہ واقعات ہی کو ترتیب کے ساتھ سپرد قلم کر سکے، کس طرح ملک معظم کی وفادار پنجابی رعایا کی دادرسی کا اہم عہدہ دیا جا سکتا ہے۔ شیخ عبدالقادر صاحب کا تیا پانچا کر چکنے کے بعد لالہ صاحب کا گوشہ چشم التفات ڈاکٹر اقبال پر مبذول ہوا، اور یہ دو لفظ کہہ کر ان کی قسمت

کا فیصلہ کر دیا کہ ڈاکٹر اقبال شعر بے شک بہت اچھا کہتے ہیں، لیکن ہائی کورٹ کچھ مشاعرہ نہیں، بلکہ یہاں قانون کے بال کی کھال کھینچی جاتی ہے اور یہی موشگافی اقبال صاحب کے حصہ میں نہیں آئی۔ میں کس طرح ان کی سفارش کر کے عدالت عالیہ کے نام نیک پر بٹہ لگانے کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہوں۔

مالوی جی مسلمانوں کے کھلے ہوئے حریف ہیں۔ جو کچھ دل میں آتا ہے صاف زبان پر لے آتے ہیں۔ کوئی مصلحت انہیں بھری سبھا میں یہ منو بر دبا کھیان دینے سے نہیں روک سکتی کہ بھارت کے سارے مسلمانوں کو شدھ کر لیا جائے، استریاں کمر میں پستول باندھ لیں، پرشن اپنی جھولیوں میں ان کے جھٹکے کی انٹیں بھر کر مسلمانوں کی کھوپڑیوں کی تواضع کے لئے تیار ہو جائیں۔ ڈاکٹر منجی ان سے بھی زیادہ منہ پھٹ واقع ہوئے ہیں۔ اور ہندو مہاسبھا کے پردھان ہونے کی حیثیت سے جلے پھپھولوں والی روانتی لی کی طرح بھارت کے طول و عرض میں بھاگتے دوڑتے ہوئے پکار رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اس ملک میں ہندوؤں کا غلام بن کر رہنا ہو گا اور اگر ذرا بھی اکڑے رہیں گے تو ڈنڈے سے ان کا سر توڑ دیا جائے گا۔ لیکن لالہ شادی لال صاحب کی حریفانہ چالوں کا انداز ہی کچھ اور ہے۔ یہ لالہ جی اندر ہی اندر وہ کام کر رہے ہیں جو ہزار مالوی اور سو ہزار منجی قیامت تک نہ کر سکیں گے۔ مسلمانوں کو ایسی جگہ مارنا جہاں پانی نہ ملے اور پھر انگریزوں کو یقین دلا دینا کہ میں تو گنگا جلی کی گاگر لئے ہوئے اپنے ان جان سے پیارے بھائیوں کی پیاس بجھا رہا ہوں ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

شہاب الدین، عبد القادر اور اقبال کو عدالت عالیہ کے آر پائی کھن میں سے بال کی طرح نکال کر لالہ شادی لال صاحب نے لاہور کے ایمہ اور مسلمان بیرسٹر کو اپنے مشہور پٹے سکے وہ ہاتھ اس طرح دکھائے کہ سارے کے سارے چت گرا دئیے۔ ان بیرسٹر صاحب کو بھی عدالت عالیہ کی رکنیت کا شوق چرایا تھا۔ حالانکہ اپنی بے باکانہ صاف گوئی کے لحاظ سے آپ کو ہرگز اس محفل میں بار یاب ہونے کا حق حاصل

نہ تھا جس کے صدر نشین لالہ شادی لال ہیں۔ اس گستاخی کا مزا آپ نے دو ہی ایک دن میں چکھ لیا۔

لالہ شادی لال صاحب سیدھے شملہ پہنچے اور بارنس کورٹ میں گورنر پنجاب کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے۔ گورنر صاحب نے لالہ جی سے پوچھا کہ شہاب الدین، اقبال اور عبدالقادر کے علاوہ اور بھی کوئی ایسا پنجابی مسلمان ہے جس میں عدالت عالیہ کی رکنیت کی اہلیت موجود ہو۔ لالہ جی نے ایک ایسے لہجے میں جس سے مسلمانانِ پنجاب کے ساتھ آپ کی والہانہ الفت کی مہکتی ہوئی بو آتی تھی۔ جھٹ ان بیرسٹر صاحب کا نام پیش کر دیا اور ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہا کہ وہ شملہ ہی میں موجود ہیں انہیں بلا کر خود ان کی صلاحیت کا اندازہ کر لیجئے۔ اس پر یہ صاحب چائے کی ایک خاص دعوت پر بلا لئے گئے اور گورنر صاحب سے ان کی باتیں شروع ہوئیں۔ لالہ جی ان بیرسٹر صاحب کی خصوصیات سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ ایک خاص موضوع پر وہ ایسے انداز میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں جو انگریزوں کو کبھی پسند نہیں ہو سکتا۔ سلسلہ کلام ابھی شروع ہونے بھی نہ پایا تھا کہ آپ نے دنیا جہان کی دوسری باتوں کو چھوڑ کر خاص اسی موضوع پر دو ایک جملے ارشاد فرمائے۔ بیرسٹر صاحب بیچارے کیا جانتے تھے کہ ان کے لئے صیاد کی عیاری نے کیسا خوفناک جال پھیلا رکھا ہے۔ لالہ جی کا لقمہ دینا تھا کہ آپ نے جو کچھ اندر تھا پوری استغراقی قوت کے ساتھ اگلنا شروع کر دیا۔ گورنر صاحب نے بہت منہ بسورا۔ مگر بیرسٹر صاحب کی گھڑی پوری طرح کوک جا چکی تھی۔ کسی طرح بند ہی ہونے میں نہ آتے تھے۔ لالہ جی دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اس مسئلے کو خوب مارا۔ آخر جب دعوت ختم ہوئی اور بیرسٹر صاحب رخصت ہوئے تو گورنر صاحب نے لالہ جی سے کہا کہ ہائی کورٹ کی ججی کے لئے کیا اسی شخص کی آپ نے سفارش کی تھی۔ لالہ جی نے نہایت معصومانہ انداز سے جواب دیا کہ یہ صاحب لائق بھی ہیں خاندانی بھی ہیں۔ لیکن مجھے آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ان

میں فتنۂ لطیفہ کی کمی ہے۔ اس طرح پر اس قبرستان میں جہاں تین مسلمان پہلے دفن ہو چکے تھے لالہ جی کی سنگدلی کدال نے ایک اور کلمہ گو کی قبر بھی چٹکی بجاتے میں کھود کر رکھ دی پھر بھی عدالت عالیہ میں اسلام کی نمائندگی ضروری تھی۔ اور لالہ شادی لال جی کے مصالح کے پہلو میں کسی نہ کسی ایسے شخص کا براجمان ہونا ناگزیر تھا۔ جو کام کا نہ سہی نام کا مسلمان تو ہو۔ اسلامی پنجاب کی قانونی نالائقی پر ابدالآباد تک لالہ جی کے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت ہو چکی تھی، اس لئے آپ کی نظر انتخاب ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی طرف اٹھ کر اپنے ڈھب کے ایک بزرگ مسٹر آغا حیدر پر پڑی، اور آج یہ مقدس بزرگ عدالت عالیہ میں مسلمانوں کے مفاد کی نگہداشت پر مامور ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ اس نگہداشت کے فرض سے آپ کس طرح سبکدوش ہو رہے ہیں مسٹر ساگر چند احال شیخ محمد امین بیرسٹر جو آپ کے ساتھ مدت سے دوستانہ راہ و رسم رکھتے ہیں۔ آپ کے دولت کدہ پر تشریف لے جاتے ہیں، اور بے تکلفی کی راہ سے باتوں باتوں میں کہتے ہیں کہ آپ کے اجلاس میں کل میرا ایک مقدمہ ہے، آپ دیکھیں گے کہ میں اس کے لئے کس طرح تیار ہو کر آتا ہوں اور اپنی قانونی قابلیت کا سکہ آپ پر بٹھاتا ہوں۔ آغا حیدر صاحب اسے اپنی توہین اور عدالت عالیہ کے بے لاگ انصاف کی توہین خیال کرتے ہیں، اور لالہ شادی لال جی سے شکایت کرتے ہیں کہ اس شخص نے میری قوت فیصلہ کا رخ صراط مستقیم سے پھیرنے کا اقدام کیا ہے جو ایک بہت بڑا جرم ہے۔ اس پر لالہ جی کے حکم سے محمد امین پر مقدمہ چلتا ہے اور ان سے تین مہینے کے لئے بیرسٹری کی سند چھین لی جاتی ہے اور جب وہ پریوی کونسل میں اس سختی کے خلاف اپیل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپیل کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک طرف تو آغا حیدر صاحب کی قانونی غیرت کا یہ عالم ہے کہ محمد امین کے ایک معمولی فقرہ کو اپنی اور برطانوی انصاف کی توہین سمجھ کر اس غریب کو وہ سخت سے سخت سزا دلوا دیتے ہیں جو ان کے اولوالعزم حاکم انتقام کے بس میں تھی۔ دوسری طرف عدل کے اس پیکر تنزیہی کی اسلامی بے غیرتی کا یہ حال ہے کہ آقائے دوجہاں کا ناموس عدالت عالیہ میں دن دہاڑے لٹتا ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتے اور ابھی تک عدالت عالیہ کی کرسی پر دھرنا دئے بیٹھے

ہیں حالانکہ جس دن کنور دلیپ سنگھ کا رسوائے عالم فیصلہ نافذ ہوا تھا، اسی دن انہیں اور ان کے دوسرے فاضل بھائی جسٹس ظفر علی کو احتجاج کے طور پر مستعفی ہو جانا چاہیئے تھا، مگر وہ استعفا کیوں دینے لگے تھے۔ محمد مصطفٰےؐ کا غصہ برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لالہ شادی لال کی چین جبین کی تاب نہیں لائی جا سکتی۔

جناب بخشی ٹیک چند صاحب میں تمام وہ اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں جنہوں نے آریہ سماجیوں کا نام بھارت کے چپہ چپہ کے اندر ایک خاص انداز سے اچھالی رکھا ہے۔ یہ وہ گن ہیں جو سکھوں، سناتنیوں، جینیوں اور عیسائیوں نے باری باری سے دیپک کی لے میں گائے ہیں۔ ہندوستان کی کوئی قوم ایسی نہیں جسے اپنے اپنے وقت میں آریوں کی گز بھر لمبی زبان سے کوئی نہ کوئی شکوہ نہ ہوا ہو۔ غریب مہاتما گاندھی جنہوں نے کبھی کسی کو برا نہیں کہا ان کی دل آزار روش کا رونا روئے بغیر نہ رہ سکے اور مسلمانوں کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ جتنے تیر آریہ سماجی ترکش سے نکل کر آج تک ان کے دل و جگر میں ترازو ہوتے ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو دنیا جہان کے ناوک فگنوں کی مشق خدنگ اندازی کے لئے کافی ہوں گے۔

ہمارے بخشی صاحب اگرچہ کوئی پیشہ ور مذہبی اپدیشک نہیں ہیں اور علانیہ کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لاتے جو گرفت میں آسکے۔ لیکن پھر بھی آپ نے بدو شعور سے آریہ سماج کی گود میں پرورش پائی ہے اور اس کے ایک نہایت ہی پرجوش اور مخلص کارکن ہیں۔ آپ مدتوں دیانند اینگلو ویدک کالج کے منتری رہے اور جب سے ہندو سبھا نے مالوی جی کی خصوصیات مختصہ کو اپنے اندر جذب کر کے ملک کی سیاسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے آپ اس کے نہایت سرگرم معاونوں میں شمار ہونے لگے۔ آپ کے طرفداروں کی ذہنیت کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ لالہ دنی چند کے مقابلہ پر مجلس وضع قوانین پنجاب کی رکنیت کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے تو لالہ دنی چند کی ایک نااہلیت ان طرفداروں کی زبان سے یہ بھی بیان ہوئی کہ لالہ جی ویروار کو جمعرات کہتے ہیں۔ آپ کی قانونی لیاقت میں کلام

نہیں اور ایک نہایت بلند مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ پرتاپ کے شہرہ آفاق مدیر مہاشہ کرشن نے جب اپنی گرہ سے روپیہ لگا کر پنڈت چموپتی ایم۔ اے سے کتاب "رنگیلا رسول" لکھوائی اور خود سک پس پردہ بن کر راج پال کو اس کے طابع و ناشر ہونے کی حیثیت سے وہ تمام ذمہ داریاں سونپ دیں۔ جن کا خمیازہ اس بدنصیب کو دفعہ ۱۵۳ الف کے ماتحت ایک طویل مقدمہ کی شکل میں دو اڑھائی سال تک کھینچنا پڑا تو مقدمہ کی پیروی کے لئے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی طرح جناب بخشی ٹیک چند کی مسلمہ قانونی قابلیت پر بھی جانی کی نگاہ انتخاب پڑی تھی۔ اور ہمارے ایک معزز ہندو دوست نے جن کی ثقاہت پر ہمیں پورا اعتقاد ہے۔ ہمیں بتایا ہے کہ جناب بخشی صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا گیا تھا کہ مقدمہ کی پیروی کے لئے کوئی محنتانہ نہ لیں۔ جو شخص کسی دنیاوی ذریعے سے نہیں بلکہ محض ایک کار ثواب سمجھ کر ایک ایسی ناپاک کتاب کی حمایت میں اپنا زور قانونی خرچ کرے جس نے مسلمانانِ ہند کے کلیجے میں ناسور ڈال دئے ہیں۔ ان کی ذہنیت کا اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

لالہ شادی لال صاحب کی عقابی نگاہ عدالت عالیہ کی رکنیت کے لئے بخشی جی پر پڑی عام قاعدہ یہ ہے کہ ججوں کا تقرر اولی امتحانا کچھ مدت کے لئے عمل میں آتا ہے۔ کہیں سالہا سال تک اپنی کارگزاری دکھانے کے بعد وہ مستقل کئے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئی ہیں کہ کسی عدالت عالیہ کا کوئی جج چھوٹتے ہی مستقل کر دیا گیا ہو۔ لیکن لالہ شادی لال کے اس منظور نظر کے لئے یہ عام قاعدہ بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اور بخشی جی بغیر اس کے کہ حکومت کے بڑے بڑے اعضا تک کو اس کا علم ہو دفعۃً و بغتۃً پوری شان استقلال کے ساتھ عدالت عالیہ کی کرسی پر بٹھا دئے گئے۔ اسی سے لالہ شادی لال کے محیر العقول اثر و نفوذ کا اندازہ کر لیجئے۔

عدالت عالیہ میں اس وقت لالہ جیپڈی صاحب کو ملا کر جن کا تقرر منظور ہو چکا ہے چار ہندو ارکان ہیں۔ جن میں سے لالہ شادی لال اور بخشی ٹیک چند کی حیثیت مستقل ہے چار ارکان انگریز ہیں جن میں دو مستقل اور دو ہنگامی۔ مسلمان صرف دو ہیں مرزا ظفر علی

اور آغا حیدر صاحب۔ ان میں مستقل صرف اول الذکر ہیں لیکن ان کا استقلال صرف ایک سال کا مہمان ہے اس کے بعد وہ وظیفہ پر علیحدہ ہو جائیں گے۔ چند سال کے بعد جب لالہ شادی لال صاحب کے منصب صدارت کی حیات مستعار کا سر رشتہ منقطع ہو گا اور یہ سوال پیش ہو گا کہ چیف جسٹس کون ہو تو براڈوے صاحب بھی وظیفہ پا چکے ہوں گے اور اس منصب کے حق دار اپنی مدت ملازمت کی طوالت کے لحاظ سے صرف فورڈ صاحب کا ہو گا لیکن سنگھٹنے شور مچائیں گے کہ عدالت عالیہ پنجاب کا چیف جسٹس کوئی ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ راٹل کمیشن آچکا ہو گا۔ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے حقوق شاید بڑھ چکے ہوں گے اور پھر یہی ہو گا کہ فورڈ صاحب تو کسی اور صوبہ میں منتقل کر دیے جائیں گے اور بخشی ٹیک چند جی چیف جسٹس ہو کر ان شاندار روایات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے جو لالہ شادی لال سے انہیں ترکہ میں پہنچی ہیں

غرض لالہ شادی لال صاحب نے بخشی ٹیک چند جی کو مستقل جج مقرر کرا کر بظاہر اس بات کی طرف سے اطمینان کر لیا ہے کہ ان کے بعد اول تو چیف جسٹس کا عہدہ کسی انگریز کو ملنے ہی نہ پائے بلکہ ہندو اور وہ بھی بخشی ٹیک چند جیسے ہندو کو ملے۔ لیکن خدا نخواستہ اگر انگریز ہی کو یہ منصب تفویض ہوا تو اس کے بعد تو ضرور ہی بخشی جی کی باری آئے مسلمان ہر حالت میں موچی کے موچی ہی رہیں۔

روزنامہ "زمیندار"

۱۳ / جولائی ۱۹۲۷ء

۴۔ جون ۱۹۲۷ء

حکومت پنجاب کی عاقبت اندیشی کا امتحان

آج یکم جون ۱۹۲۷ء ہے۔ تین کے بعد کبھی نہ مٹنے والی نفرت اور ہمیشہ تک زندہ رہنے والی دشمنی کا وہ جذبہ جو بھائی پرمانند اور ان کے ہم خیالوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک خاص وضع کے ہندوؤں کے سینہ کے اندر اپنی مجاہدانہ کوششوں سے ابھارا ہے۔ بیر بیراگی بندہ کی برسی منا کر اور زیادہ ابھارا جائے گا۔ پنجاب کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جہاں جہاں آریہ سماج کا جال پھیلا ہوا ہے اور جس جس گوشہ میں سناتن دھرم اپنی پرانی صلح جویانہ روایات کو خلا نجلی دے کر آریہ سماج کی نئی جنگجویانہ روح اپنے اندر خوب کر چکا ہے۔ بیر بیراگی بندہ کا یادگاری جشن منایا جائے گا۔ جلوس نکالے جائیں گے اور ہندوؤں کو بتایا جائے گا کہ اگر پنجاب میں عزت اور آبرو سے رہنا چاہتے ہو تو ایسے ہی ہو جاؤ جیسا بندہ تھا اور دھرم اور ہندو جاتی کی رکھشا کے لئے جو طریقے اس نے اختیار کئے وہی تم بھی اختیار کرو۔

"۴ جون ۱۹۲۷ء کے مبارک روز کی یاد کو زندہ جاوید بنانے کی غرض سے (بھیشم، یکم جون ۱۹۲۷ء صفحہ ۹) بیر بیراگی بندہ بہادر کے جن کارناموں سے جاتی کو روشناس کرایا جائے گا وہ کیا ہوں گے؟ اس سوال کا جواب "بندہ بیر بیراگی کے جیون چرتر کے مصنف ساہتیہ النکار بخشی گردھاری لال پریتم سے سن لیجئے جن کی تعلیم کا حرف حرف آج جاتی کے دل پر نقش ہے اور جس کو "ہر ایک ہندو بچے کے ہاتھوں تک پہنچانے کی تیاریاں نہایت دھوم دھام کے ساتھ بڑے وسیع پیمانہ پر لاہور میں ہو رہی ہیں

جو جنیو اور چوٹی دکھائے اسے زندہ چھوڑ دو باقی سب کو موت کی آغوش میں سلا دو اور لوٹ کا مال جتنا جس کو ملے وہی اس کا مالک ہوگا (جیون چرتر صفحہ ۸۲)

چند مسلمان ایک گائے ذبح کر رہے تھے۔ گئو ماتا کا قتل دیکھ کر بیراگی بیر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ فوج کو حکم دیا کہ اس گاؤں کا بچہ بچہ گئو ماتا پر سے قربان کر دو۔ حکم ملنے کی دیر تھی۔ دو گھڑی کے اندر لاشوں کے انبار لگ گئے۔ گاؤں کی جگہ کسی پرانے شہر کے کھنڈرات دکھائی دینے لگے۔ (جیون چرتر صفحہ ۸۲)

سامانہ کی طرح اس شہر (کنج پورہ) کا نام و نشان مٹا دو، جنیو چوٹی کے سوائے باقی تمام کو شربت موت پلا دو۔ اپنے جرنیل کا حکم ملتے ہی فوجیں کنج پورہ پر ٹوٹ پڑیں۔ بچے بوڑھے تلوار کی بھینٹ چڑھا دئے جنیو چوٹی دکھانے والوں کے سوائے باقی چن چن کر ملک الموت کے پاس پہنچا دئے۔ (جیون چرتر صفحہ ۸۳)

بندا بہادر نے اپنی تھوڑی سی فوج جیت بلوٹہ کی طرف روانہ کی۔ فوج نے جاتے ہی قتل کا بازار گرم کر دیا۔ جنیو اور چوٹی والے کے سوائے دوسرے کو زندہ رکھنے کا حکم نہیں تھا۔ اس لئے فوج نے بھی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسلمان آبادی کو موت کے تختہ پر سلا کر مال و زر لوٹ کر بندا بہادر کی خدمت میں حاضر کیا (جیون چرتر صفحہ ۹۱)

شہر (سرہند) میں قتل عام کا حکم ہو گیا۔ شہر کی تمام مسجدوں اور مقبروں کو خاک میں ملا دیا۔ گلی محلوں میں خون کا دریا بہا دیا۔

(جیون چرتر صفحہ ۹۳)

تمام مسلمان سرداروں نے گڑگڑا کر منت سماجت کی کہ ہم سے بھول ہوئی۔ ہمیں بخش دو — ہم تا زندگی غلام رہیں گے مسلمان ہوا اگر یہ

وزاری کرتے ہوئے ناک رگڑ کر معافیاں مانگ رہے تھے مگر بندہ دل میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ ان کی بات پر اعتبار کرنا گویا اپنی موت کو مہمان بلانا ہے ۔ یہ سوچ کر بندہ بہادر نے کہا کہ جو مسلمان اس حویلی میں پناہ گزیں ہوں گے ۔ انہیں معاف کر دیا جائے گا ۔ اور باقی تلوار کے بھینٹ ہوں گے ۔ بندہ بہادر کا یہ فرمان سن کر جان کی امان چاہنے کی خاطر سب مسلمان اس حویلی میں پناہ گزیں ہوئے ۔ حویلی اس قدر کھچا کھچ بھر گئی کہ تل پھینکنے کو جگہ نہ تھی ۔ ہزاروں ایک دوسرے کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گئے ۔ جب بندہ بہادر نے دیکھا کہ دشمن خود بخود جال میں پھنس گئے ہیں تو اپنے بہادروں کو حکم دیا کہ قتل عام کر کے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دو اور پیاسی تلواروں کی پیاس ترکوں کے خون سے بجھاؤ ۔ حکم ملنے کی دیر تھی ۔ بھوکے شیروں کی طرح سنگھ شکار پر جھپٹ پڑے ۔ تھوڑی ہی دیر میں حویلی کے اندر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے ۔ خون کا دریا بہ نکلا تمام بوڑھا بچہ قتل کر کے (بندہ بہادر کے بہادروں نے دم لیا (جیون چرتر صفحہ ۸۸)

آخر جیٹھ سمت ۱۷۶۵ چودس کے دن ایک بڑا دربار کیا اور سب علاقہ میں مسلمان عہدے دار ہٹاکر ہندوؤں کو عہدے دار مقرر کیا اور اپنی فوج کے سرداروں میں سب کام بانٹ دیئے ۔ فتح سنگھ کو فوج کا سپہ سالار بنایا ، باج سنگھ کو خزانہ کا افسر مقرر کیا اور ملکی انتظام بندو سنگھ اور کاہن سنگھ کے سپرد ہوا ۔ مسلمانوں کی تمام جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لیں .... بندہ بہادر نے تحریر کیا کہ تھوڑی سی کسر باقی ہے ۔ ایشور سہائے رہی تو چند روز میں ملک پنجاب میں پھر سے ہندو راج قائم کر دوں گا ۔ (جیون چرتر صفحہ ۹۲)

ان تمام مقدس کارناموں کی داد آج کل ہندو جاتی اپنے سب سے بڑے ہیرو کو ان الفاظ میں دیتی ہے ۔

دھن ہے بیر بیراگی کی آتمک شکتی پر کہ اتنا کچھ ہونے پر بھی سب کچھ تچھ سمجھتا ہوا مادھو مدھو سودن کی بھگتی سے چت نہیں ہٹایا۔ اگر بیراگی چاہتا تو ہندو راج استھاپن کرنے کے بعد خود کو راجہ کہلواتا مگر اس نے فقیری میں آنند سمجھ کر دنیاوی جھوٹے راج کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ صرف ہندو دھرم اور قوم کی رکھشا کے لئے آیا تھا نہ کہ راج لینے کی خواہش سے (جیون چرتر صفحہ ۹۸)

آج ہم کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی مردہ ہیں کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اندر بندہ گوں کا دو خون نہیں رہا جس سے ہم ویر کہلا سکیں۔ (جیون چرتر صفحہ ۱۵۰)

جاتی کی رگوں کے اندر یہ خون از سر نو پھر کس طرح دوڑ سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی خود جاتی ہی کی زبانی سن لیجئے۔

اگر بیر بیراگی کی قربانی کا کچھ حق ادا کرنا چاہتے ہو تو پنجاب کے ہر ایک شہر، قصبہ اور گاؤں گاؤں میں اس کی یادگار مناؤ۔ اس کے نام پہ میلے لگاؤ، اس کی جے دھونی سے آکاش کو گونجا دو تاکہ اس پرم بھگت کی آتما بھی اشیر باد دے کر کلیان کرے۔ (جیون چرتر صفحہ ۱۵۱)

یہ نہ سمجھئے کہ یہ الفاظ صرف "جیون چرتر" کے مصنف ساہتیہ النکار بخشی گردھاری لعل پر ہی ختم ہو گئے ہیں۔ اور ان کی ذمہ داری صرف انہیں کی ذات پر ہے اس ذمہ داری میں آریہ سماج تو ایک طرف رہا، خود سناتن دھرم کے بڑے بڑے روشن خیال اور تعلیم یافتہ لوگ بھی برابر کے شریک ہیں جو فرماتے ہیں کہ۔

آج تک سناتن دھرمیوں نے اپنے دھرم رکھشک کی یاد کو دل سے بھلایا ہوا تھا۔ آشا ہے کہ اب اس "جیون چرتر" کو پڑھ کر سناتن دھرم اور بھی جگہ جگہ ایسے بہادر کی یادگاریں قائم کر کے بیر بیراگی کی قربانی کا حق ادا کریں گے۔

امن و امان اور صلح و سلام کے ان سناتن دھرمی دیوتاؤں کے نام بھی سن لیجئے۔

کشن چند بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی وکیل۔ دونی چند گپتا بی۔اے۔ایل ایل بی۔ وکیل ہائی کورٹ۔ کرپا رام بی اے ایل ایل بی وکیل

درگا دت بی۔اے ایل ایل بی وکیل۔ وشنو پرشاد فدا، لچھمن ناتھ پروفیسر، ہیمراج جوتشی، پران ناتھ، فقیر چند، برج لال کھنہ، بخشی نانک چند، دیال داس مہنت لاہور۔

لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باعث ۴ جون کو بندا بیراگی کی برسی نہ منائی جا سکے گی۔ لیکن "ملاپ" تمام ہندو جاتی کے نوراتیجہ شگفتی جذبہ سے امید رکھتا ہے کہ پنجاب کے دوسرے حصوں میں جہاں لاہور کی پابندیاں موجود نہیں ساس دن بندا کی یاد ذوق و شوق اور جوش و خروش سے منایا جائے گی" مہاشیم" بھی ایک عرصہ سے بندا کے ایک نئے جیون چرتر کا اشتہار شائع کر رہا ہے جو تین پیسے میں ہر ہندو بچے کے ہاتھوں تک پہنچایا جائے گا۔ اور بتا رہا ہے کہ بندا کی یاد برقرار رکھنے سے بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں۔ کہ جس طرح اس نے ہندو جاتی کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکی تھی۔ اور روتی ہوئی ہندو ماتاؤں کی اشک شوئی کی تھی۔ اسی طرح آج بھی پنجاب میں ہزاروں، لاکھوں بندا بہادر پیدا ہو کر دکھیا ہندو ماتاؤں کے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھے جائیں۔

حکومت کی آنکھیں بھی ہیں، کان بھی ہیں اور ہاتھ بھی ہیں جو بہت ہی لمبے واقع ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے ایسے ناپاک اور زہریلے لٹریچر کی اشاعت پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کرنا اسی کی امپیریل مصلحتوں کا حصہ ہے، جن کے ابوالہولی چہرہ سے پردہ اٹھانا ہمارا کام نہیں۔ وہ جانے اور اس کی بندہ نوازی لیکن ہم بھی اپنی خو سے مجبور ہیں اور اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ اگر وہ حقیقت میں چاہتی ہے کہ جنتو اور چھوٹی دکھانے والوں اور گھر رکھنا کرنے والوں کے سوا باقی تمام لوگ قتل کر دئے جائیں اور لوٹ لئے جائیں تب تو اسے علانیہ تسلیم کر لینا چاہئیے۔ کہ جو خون آشام روایات ۴ جون

سے وابستہ ہیں، انہیں زندہ رکھنے اور گھر گھر پھیلانے کی پنجاب کے ہر ہندو کو اجازت ہے، لیکن اگر اس کے نزدیک یہ رعایات پنجاب کے ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کی قومی ہستی کے حق میں سم قاتل ہیں، تو پھر اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ انہیں اسی طرح کچل کر رکھ دیا جائے۔ جس طرح ایک بچھو کچل دیا جاتا ہے۔

مسلمانان پنجاب کی طرف سے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ کسی جگہ بندا کی برسی نہ منائی جائے اور اس شخص کا کوئی جلوس نہ نکالا جائے کیا دفعہ ۱۴۴ صرف مسلمانوں کے جلسوں اور مسلمان مقرروں کی زبانوں ہی کے لئے ہے کیا اس دفعہ کی زد سنگھ ٹیلیوں پر نہیں پڑ سکتی؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر مونجی کی رگ گردن نے سورت کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اسی طرح نفی میں دیا ہے جس طرح کلکتہ کے مجسٹریٹ کو مالوی جی نے دیا تھا۔

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ پنجاب کی حکومت اس سوال کا جواب ۱۹ جون والے دن بندا پرست سنگھ ٹیلیوں کو کس طرح دیتی ہے۔

روزنامہ "زمیندار"

۱۳ جون ۱۹۲۷ء

محمد مصطفےٰ کے دشمنوں کا انجام

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ

ہم مسلمانوں کا یہ ایمان کہ آفرینندۂ کون و مکان کے بعد اس کائنات کی بزرگ ترین ہستی ہمارے آقا و مولا حضور محمد عربی ہیں، کہ ان پہ ہماری جان، ہمارا ایمان، ہماری آل و اولاد، ہمارے ماں باپ، ہمارا ننگ و ناموس اور ہر چیز جو ہمیں عزیز سے عزیز ہو۔ نچھاور ہو جانے اور قربان کر دینے کے لئے بنائی گئی ہے۔ چالیس کروڑ انسان آج ان کے نام اقدس پہ کٹ مرنے کے ذریعہ فلاح دینوی و وسیلۂ نجات اخروی سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے کہ جو شخص یا جو قوم دونوں جہانوں کے اس سردار انسانیت کے اس سب سے بڑے محسن کی دشمن ہوگی، وہ خود خدا کے بزرگ و برتر سے اپنی دشمنی کا اعلان کرے گی اور ذلیل و خوار و رسوا ہو کر اس طرح تباہ و برباد ہوگی اور اس کا نام و نشان دنیا سے یوں مٹا دیا جائے گا کہ گویا وہ سراپردۂ عدم سے نکل کر کبھی منصۂ شہود پہ آئی ہی نہ تھی۔ ہمارے اس ایمان کا مضحکہ اڑانے والے اس دنیا میں بہت سے لوگ موجود ہوں گے، اور ہمارے عقیدہ کو اوہام باطلہ کا ایک گورکھ دھندا سمجھنے والوں کی بھی اس سرائے سپنجی میں کمی نہیں لیکن وہ جنہیں آنکھیں دی گئی ہیں گذشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور دیکھ لیں کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا حرف حرف صحیح ہے یا نہیں۔ وہ جو دل کے کان رکھتے ہیں، انہیں کھولیں اور زمانہ سے سن لیں کہ ہر وہ بے ادب جس نے سرورِ کون و مکاں سے گستاخی کی جرأت کی موت مرا اور اس کی نسل تک اس دنیا سے مٹا دی گئی۔

کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ بدر کے میدان میں ان کا فعل کا ان بدبختان ازلی نے کیسا ہولناک خمیازہ کھینچا۔ عرب کے بدزبان

یہودیوں کو حضور انور سے دشمنی تھی دنیا نے دیکھ لیا کہ ان دریدہ دہن خبیثوں کا ایک بھی نام لیوا جزیرۃ العرب میں آج نظر نہیں آتا۔ آلِ ساسان کی عظمت و جلال کے زندہ مجسمہ خسرو پرویز سے اتنا ہی قصور ہوا تھا کہ حضور اقدس کے نامۂ مبارک کو اس شقی ازلی نے چاک کر کے رود فردوس کی موجوں میں بہا دیا تھا اور یہ ناپاک خرافات بکی تھی کہ محمد ہمارا غلاماں غلام ہو کر ہم کو جو مسودہ بیچ کے بیٹھے ہیں، ایک خدا کی پرستش کی گستاخانہ دعوت دیتا ہے۔ سو دنیا نے دیکھ لیا کہ ساسانیوں کی قبائے حشمت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑ گئیں، اور اس کی نسل اس کی قوم اور اس کی سلطنت کی یادگار روزگار میں دب کر ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئی۔ پرستاران صلیب نے تاجدار یثرب و بطحا کی دشمنی کا علم اٹھایا لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ہر موقعہ پر ذلیل ہوئے اور منہ کی کھائی۔

حضور سرور کون و مکان کی رحمۃ للعالمینی نے ایک ہزار سال تک ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنے دامانِ عاطفت میں پناہ دئے رکھی ان کے دھرم کی حفاظت کی گئی۔ ان کے مندروں کو جاگیریں بخشی گئیں ان کی چوٹیاں اور زنار سلامت رہے ان کو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا گیا اور آج یہ قوم جو اپنے تیتیس کروڑ ہونے پر اترا رہی ہے، صرف اسلام کے علمبردار اعظم کی شریعت کی بیکس نوازی کے صدقہ ہی میں اپنی ہستی پر نازاں ہے۔ ورنہ ان کا حشر بھی وہی ہوا ہوتا جو اندلس میں مسلمانوں کا ہوا اور آج ایک ہندو بھی رام نام جپنے کو بھارت میں موجود نہ ہوتا لیکن آہ دنیا کس قدر حق ناشناس اور احسان فراموش واقع ہوئی ہے کہ انہیں ہندوؤں کا ایک طبقہ اٹھا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی ایسی فحش گالیاں دینے لگ جاتا ہے کہ تہذیب انسانی مارے شرم کے اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔ خدائے ذوالجلال کی غیرت کا پیالہ چھلک اٹھتا ہے اور قریب ہے کہ ان ملاعنہ کا تختہ الٹ دیا جائے اور جو حشر اس دفع و فاحش کے بدبختان ازلی کا اس سے پہلے ہو چکا ہے وہی ان کا بھی ہو۔

ہندو دھرم کو ایک ہزار سال تک اسلام سے متصادم ہونے کی جرأت نہیں ہوئی

وہ برابر ویدن آشرم کی کمینگاہ میں چھپا رہا اور اسی لئے بچا رہا اب وہ گھات پاکر باہر نکلا ہے اور شدھی اور سنگھٹن کے اوچھے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر اسلام کو نیست و نابود کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کی اسے اجازت ہے۔ اسلام کی چٹان سے وہ اپنا سر ٹکرا کر دیکھ لے اور یہ ارمان بھی دل میں نہ رہنے دے لیکن دھرم کے نام پر آریہ سماجیوں اور ان کی پیٹھ پر تھپکی دینے والوں نے خدا کے برگزیدہ ترین رسول محمد مصطفےٰ کو اپنے ناپاک سب و شتم کی آماجگاہ بنانے کا جو ابلیسی وطیرہ اختیار کیا ہے اس کا ایک اور صرف ایک انجام ہوگا۔ وہ ذلت کی موت مریں گے۔ ان کی نسل قطع کر دی جائے گی، اور ان کی شمشان بھومی پر بھارت کے طول و عرض میں دو آنسو بہانے کو بھی کوئی موجود نہ ہوگا۔ اسے مجذوب کی بڑ نہ سمجھو۔ کیونکہ خود خداوند جل و علی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اے محمدؐ تیرے دشمنوں کی نسل ہمہ دنیا سے مٹا دی جائے گی۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ

روزنامہ "زمیندار"

۴ر جولائی ۱۹۲۷ء

سر مائیکل اوڈوائر کا تازہ کلام

ہندوستان کی دائمی غلامی کے لئے رجعت پسند انگریزوں اور ان کے مہندوؤں کی سازش

پنجاب کے سابق لفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر جن کی ٹوپی پر جلیانوالا باغ کے قتل عام نے لیفٹیننٹ دوام کی ارغوانی کلغی لگا رکھی ہے برطانوی قوم کے ان ناپاک فرزندوں میں سب سے بڑا درجہ رکھتے ہیں جن کا ایمان ہے کہ اگر ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت ایک لمحہ کے لئے بھی ڈھیلی ہو جائے تو ہندو اور مسلمان آپس میں کٹ مریں گنگا سے لے کر راس کماری تک خون کے دریا بہہ نکلیں۔ قلات سے چلی کر رنگون تک وہ آگ لگے کہ کسی کے بجھائے نہ بجھے۔ ان مقدسین ڈنگ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں ان کی موجودگی کی غایت الغایات جیسا کہ بعض بدطینت لوگ کہتے ہیں کچھ ہوس جلب منفعت نہیں بلکہ اس ملک کی ہمسایہ قوموں کو جو ہمیشہ سے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی چلی آئی ہیں آپس میں دست و گریباں ہونے سے بچانا ہے۔ اگر ہمدردی بنی نوع کا یہ جذبہ جو تہذیب انسانی کے مغربی گہوارہ میں پل کر جوان ہوا ہے ان کے بے غرضانہ ایثار کو ابھارنے والا نہ ہو تو وہ آج اس استروں کے مالا کو جس کا نام ہندوستان کی حکومت ہے اپنے گلے سے اتار پھینکیں اور بوریا بستہ اٹھا کر لندن واپس چلے جائیں۔

سر مائیکل کے خیال میں برطانیہ کی وہ فولادی گرفت جو ہندوستان کے امن وامان کی ضامن تھی، اول اول ۱۹۱۸ء میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفرڈ کی عاقبت نااندیشی کے ہاتھوں ڈھیلی ہوئی اور اسی وقت سے ان خونریز ہنگاموں کی بنیاد پڑ گئی جنہوں نے آج ہندوستان کے چپہ چپہ کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے خون سے سیراب کر رکھا ہے۔ مجالس وضع آئین و قوانین کو جو تھوڑی بہت آزادی مانٹفورڈ کی اصلاحات

نے دے دی اگر نہ دی جاتی اور نظم و نسق مملکت کے شعبہ ہائے منتقلہ میں جو برائے نام اختیارات ان نااہل ہندوستانیوں کو بخش دئے گئے اگر نہ بخشے جاتے تو آج برطانیہ کے مشرقی ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکا نہ لگنے پاتا کہ جس طرف جاؤ مسلمان ہندو کا ٹینٹوا دبوچے نظر آتا ہے، جس طرف آنکھ اٹھاؤ ہندو مسلمان کی کھوپڑی کو اینٹیں مار مار کر لہو لہان کر رہا ہے اور حکومت ہے کہ باوجود طاقت رکھنے کے ان سر پھٹول کو نہیں روک سکتی۔ پر نہیں روک سکتی۔ ان خیالات کا اظہار سر مائیکل اوڈوائر اپنے انداز خصوصی میں کئی بار فرما چکے ہیں اور اب چونکہ رائل کمیشن کی آمد آمد کا غلغلہ ہر طرف بلند ہے اور سر مائیکل کے رجعت پسند دوستوں کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ فولادی گرفت جو بتیس کروڑ بندگان خدا کے مال اور جان اور ناموس کی محافظ ہے کسی قدر ڈھیلی ہو کر ہندوستان کو بالکل ہی تباہ و برباد نہ کر دے، اس لئے سر مائیکل نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنے اور اپنے یاران سربل کے عقیدہ کا اعلان اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے از سر نو کر دیں چنانچہ ایک طویل اندیلی مقالہ کے دوران میں جو آپ نے ۷ ارمئی کے "مارننگ پوسٹ" میں چھپوایا ہے فرماتے ہیں۔

۴ رمئی والے دن لاہور میں پندرہ آدمی مارے گئے اور دو سو زخمی ہوئے۔ بڑی خیریت ہوئی کہ گورہ فوج قریب ہی تھی اور برطانوی مجسٹریٹوں اور پولیس افسروں نے جن سے ہندوستانی مجاہرہ طرازانہ جلد جلد اپنا پیچھا چھڑا رہے ہیں۔ اپنی چابکدستی سے صورت حال پر قابو پالیا۔ ورنہ سب کے سب ہندو اور مسلمان اور سکھ آپس میں کٹ مرتے اور دو ڈھائی لاکھ کی آبادی کا یہ شہر کھنڈر ہو کر رہ جاتا۔

گزشتہ چھ سال کے دوران میں ہندوستان کے ہر بڑے شہر کے اندر اسی قسم کے مذہبی ہنگامے برپا ہو چکے ہیں۔ جن میں سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور ہزاروں انسان زخمی ہوئے [illegible] مسلم سنہ ۱۹۱۹ء تک تو جنتوں اور فسادات مابعد کا نام ہے پنجاب

کا لفٹیننٹ گورنر رہا - اور اگرچہ بیرونی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور اندرونی سازشوں کی انگیخت پر ملک میں کبھی کبھی فساد ہو جاتے تھے اور انقلابی ہنگاموں کا مواد بھی پھوٹ پڑتا تھا لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ایک جان بھی اس طویل دور میں اس فرقہ وار کشمکش کی بھینٹ چڑھی ہو - جس کے خونریز مظاہرے اب قریب قریب ہر ہفتے پیش نظر ہو رہے ہیں -

سوال یہ ہے کہ اس تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟ اس خوفناک فرقہ وار کشمکش کا باعث مقامی حکام کی کمزوری تو یقیناً نہیں ہو سکتی اس لئے کہ پنجاب کی عنان حکومت اس وقت سر میلکم ہیلی کے ہاتھ میں ہے جن سے زیادہ خوش تدبیر حاکم پنجاب کو آج تک نصیب نہیں ہوا اور جن کی نگرانی میں اس صوبہ نے حیرت انگیز مادی ترقی کی ہے - ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ مختص المقام نہیں بلکہ اس کی ہمہ گیری کی لپیٹ میں سارا ہندوستان آیا ہوا ہے -

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں سطح سے اتر کر گہرائی میں جانا پڑے گا - جنوری ۱۹۲۰ء میں موجودہ فرقہ وارانہ تصادم کی ہولناکیوں سے مدتوں پہلے جب میں لاہور میں تھا اور ان اصلاحات کے حسن و قبح پر بحث ہو رہی تھی تو میں نے اس قصیدہ کے تصنیف کرنے والوں کو حسب ذیل استفسار سے ضغطہ میں ڈال دیا تھا -

"کیا ہمارے پاس اس بات کی کوئی ضمانت موجود ہے کہ جب برٹش گورنمنٹ اپنے بعض اختیارات سے دست کش ہو جائے گی تو ہندوؤں اور مسلمانوں، برہمنوں اور غیر برہمنوں، مرہٹوں اور راجپوتوں، سکھوں اور پٹھانوں کی پرانی کشمکش پھر تازہ ہو جائے گی اور وہ مقامی یا عمومی تفوق کے لئے ایک دوسرے سے دست و

گریباں نہ ہو جائیں گے؟ جو کچھ میں نے کہا تھا اس کا حرف حرف آج پورا ہو رہا ہے اور جو خطرہ میں نے ظاہر کیا تھا وہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں جب فرقہ وارانہ فسادات زوروں پر تھے۔ کلکتہ کے ایک اخبار میں ایک ہندو نامہ نگار نے بیان ذیل شائع کرایا تھا۔

"ایک قوم کے دل میں دوسری قوم کی طرف سے جو نفرت بیٹھی ہوئی ہے اسے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسی طاقت کا خوف ہے جو دونوں پر غالب ہو۔ برٹش گورنمنٹ نے اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر اس خوف کو دل سے نکال دیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزی تسلط سے پہلے ہم ایک دوسرے کا گلا کاٹا کرتے تھے۔ اب پھر ہمارا یہی شغل ہوگا اور ہمیں اس مشغلہ سے روکنے والا کوئی نہیں۔"

یہ ایک تلخ قول ہے مگر اس کے سچ ہونے میں کلام نہیں۔ اس قول کی تصدیق لاہور کے ایک بلند مرتبہ ہندو جنٹلمین نے جو وسیع تجربہ رکھتے ہیں اپنی ایک چٹھی میں کی تھی جو چند مہینے ہوئے میرے نام آئی تھی۔ اس چٹھی میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہندو اور مسلمان پہلے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے فرقہ وارانہ تصادم مفقود تھا۔ لیکن جب سے مسٹر مانٹیگو نے اصلاحات کے فتنہ کا بیج بویا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک دوسرے پر مباح ہو گیا ہے۔ اس سوراج کے شور میں جو چاروں طرف بپا ہے ہماری جانیں ایک لمحہ کے لئے بھی سلامت نہیں ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ صحیح خیالات کی اشاعت سے اس پٹی کو جو انگریزی قوم کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے اتارنے کی کوشش فرمائیں گے۔"

ہمارے مخدوم محترم جناب راجہ نرندر ناتھ باتقابہ کا وسیع تجربہ شاید اس معمّا سراز نکتہ کو حل کر سکے کہ سر مائیکل اوڈوائر کے نام لاہور کے جن بلند پایہ اور آزمودہ کار بزرگ نے یہ مکتوب ارسال فرمایا ہے وہ کون ہیں اور جو التجا انہوں نے اپنے مکتوب میں سر مائیکل سے کی ہے وہ کانگرس کی تمنا ہے یا ہندو سبھا کی آرزو یا خود ان کے دماغ شریف کی حسرت، لیکن ہمیں سر مائیکل کے ہندوستانی پٹھوؤں اور ان کی خرافات سے یہاں کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم خود سر مائیکل کے کلام لطیف پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

سر مائیکل اوڈوائر کا مضمون کیا ہے۔ متناقض مہملات اور متنافی لغویات کی ایک پوٹ ہے۔ جس کی دھجیاں بارہا بکھیری جا چکی ہیں اور جس کے مزید پرخچے اڑانے سے بجز تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں۔ لیکن از بسکہ ایک خاص وضع کے انگریزوں اور ایک مخصوص ذہنیت کے ہندوؤں میں ان کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں بعض ان حقائق کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا ہے۔ جنہیں بے نقاب کرنے کا ہمیں پہلے سے خیال تھا، اس لئے ان کے مزخرفات لا یعنی کی تنقید ناگزیر ہو گئی

سر مائیکل کی رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی موجودہ کشمکش کا باعث فقط مسٹر مانٹیگو کی حکمت عملی ہے اور تمام ان فرقہ وار فسادات کا سرچشمہ جنہوں نے ہندوستان میں آج بھلے لوگوں کی عافیت تنگ کر رکھی ہے، ۱۹۱۹ء کی اصلاحات ہیں۔ جن کے نفاذ سے پہلے مذہب کے نام پر کبھی کوئی خونریز ہنگامہ برپا نہ ہوا تھا۔ اگر یہ اصلاحات واپس لے لی جائیں اور ہندوستان پھر اسی حالت کی طرف عود کر آئے جو آج سے نو دس سال پہلے تھی تو یہ خرابیاں خود بخود مٹ جائیں۔ دشمنی دوستی سے بدل جائے، نفرت محبت کی جگہ لے لے اور ہندو اور مسلمان شیر و شکر ہو کر برادرانہ یکجہتی کی زندہ تصویریں بن جائیں۔

اصلاحات کو ہنگامہ لاہور اور اسی قسم کی دوسری بیسیوں خونریز حوادث کا ذمہ دار قرار دیتے وقت سر مائیکل اپنے بلند پایہ اور آزمودہ کار لاہوری حاشیہ بوس کی فرمائش پر انگریزی قوم کے دل میں یہ خیال بٹھانا چاہتے ہیں کہ دولت برطانیہ

قیام امن و امان کی ہندوستانی ذمہ داریوں سے خود دست کش ہو چکی ہے اور وہ ساری قوتیں جن پر اس امن و امان کا انحصار تھا ہندوستان کو سونپ چکی ہے۔ اب یہ حربے ان نااہلوں کے ہاتھ میں ہیں اور وہ انہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ استدلال تو بظاہر وزنی ہے لیکن اگر انگلستان والے کچھ بھی سوچ رکھتے ہیں تو ان لال بجھکڑ سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا حقیقت میں فوج اور پولیس کی باگ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے؟ کیا وہ گولہ بار توپیں اور سنگینیں اور طیارے جو ۱۹۱۰ء سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خون بہانے سے روکا کرتے تھے اب ان بدبختوں کے ہاتھ میں آگئے ہیں اور وہ بالکل آزاد ہیں کہ جب چاہیں ایک دوسرے پر گولیاں اور بم برسائیں جب موقع ملے ایک دوسرے کے جگر میں سنگینوں کی خونی مثال انیاں پیرادیں؟ کیا قانون تعزیرات ہند کی دفعات پر اب سوراج کا پہرہ بیٹھ گیا ہے اور جیل خانوں کے پھاٹکوں کو کانگرس اور خلافت اور ہندو مہاسبھا کے سنتریوں نے آپس میں بانٹ لیا ہے؟

مانا کہ "مارننگ پوسٹ" بڑا ہی غالی ملوکیت پرست ہے اور اس کا حلقۂ ناظرین جو جناب معلم الملکوت کی روایتی امت کی طرح بہت ہی لمبا ہے۔ ہندوستان کے پاؤں میں قیامت تک کے لئے استعمار کی فولادی بیڑیاں پڑی ہوئی دیکھنے کے لئے بیتاب ہے، لیکن اس رجعت پسندانہ کم نظری کے باوجود تھوڑی بہت بینائی ضرور رکھتا ہے سرمائیکل اوڈوائر کی خرافات کو چھاپتے وقت اس کھلی ہوئی حقیقت سے چشم پوشی کی جرأت اسے کیوں کر ہوئی کہ مسٹر مانٹیگو کی اصلاحات کے باوصف لندنی آقاؤں کے ولوی اقتدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ خزانہ ان کے ہاتھ میں ہے، پولیس ان کے ہاتھ میں ہے عدالت ان کے ہاتھ میں ہے، جیل خانے ان کے ہاتھ میں، غرض امن و امان کے قیام کا سارا جبروتی نظام ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ قانون کا حکم رکھتا ہے جسے چاہیں مقدمہ چلائے بغیر کسی معین یا غیر معین مدت کے لئے جیل میں ٹھونس دیں۔ ایک قوم کی قوم کو وطن سے بے وطن کر کے ہمیشہ کے لئے کالے پانی بھیج دیں جس راجہ اور

نواب کو جب چاہیں گدی سے اتار دیں یا نہ اتاریں تو سارے اختیارات چھین کر بالکل بے دست و پا کر دیں اور اپنی ایک گھرکی سے کروڑوں انسانوں کا خون کھڑے کھڑے خشک کر دیں۔

جن اصلاحات کا حلیہ سر مائیکل کے تھے سر اب یہ سوہان روح بنا ہوا ہے ان کی حقیقت ایک جھنجھنے سے زیادہ نہیں جو ضدی بچوں کے ہاتھ میں تھما دیا گیا ہو۔ نظم و نسق مملکت کے وہ بڑے بڑے شعبے جو مختار حکومت کی جان ہیں اپنے لئے محفوظ رکھ کر چند چھوٹے موٹے سر رشتے ہندوستانیوں کو تفویض کر دیئے گئے ہیں اور ان کی بھی یہ حالت ہے کہ وزیر سر رشتہ گورنر کے اشارۂ ابرو پر ناچنے کے لئے مجبور ہے اور نہ اس کی خواہش کے خلاف قلم کو جنبش تک نہیں دے سکتا۔ کونسلوں کا یہ حال ہے کہ شعبہ جات متحفظہ کا تو ذکر ہی کیا شعبہ جات منتقلہ کے متعلق بھی کوئی قرارداد پیش ہو کر بالاتفاق یا بلغلب آرا منظور ہو جائے تو حکومت کو اختیار ہے کہ اس کے نفاذ کو جب تک چاہے کھٹائی میں ڈالے رکھے یا بیک گردش قلم، بیک جنبش لب فوراً رد کر دے۔

جب یہ حالت ہو تو یہ دعویٰ کرنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اصلاحات نے انگریزوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انہیں راوی کی بے بسی میں بٹھا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ناتواں بازوؤں کو وہ طاقت بخش کر جس کے استعمال کی اہلیت ان میں مطلق نہ تھی انہیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ انگلستان کی عام آبادی جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ خادی لال بلغٹے ہیں یا پٹھان اور جس کے حکمران طبقہ کا یہ حال ہے کہ ان لالہ جی کو پنجاب کی مجلس عالیہ عدالت کی صدارت مرحمت فرماتے وقت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر یہ بہت بڑا احسان کیا ہے، اگر سر مائیکل کی منطق کو درست سمجھ لے اور دہلی کے جو رانے ہیں کی خاک کی جو مٹھیاں بھر بھر کر وہ ان کی آنکھوں میں جھونک رہے ہیں انہیں پیر وطمیسر میا سنگھ اہلو والیہ کا سرمہ سوا لاسرمہ جان لے تو کچھ تعجب کا مقام نہیں۔ لیکن اس ملک کے لوگ ان کے دم جھانسوں میں نہیں آ سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ کلکتہ والے اینگلو انڈین اخبار

اور لاہور والے بلندپایہ ہندوستان پھنسنے کی طرح ہندوؤں کی ایک جماعت جس کی تعداد میں ہندوستان کی بدبختی سے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، کاٹھ کی پتلی بنی ہوئی اسی تار کے اشاروں پر ناچنے لگ گئی ہے جس کا سرا سر مائیکل اوڈوائر کی تال بی تال ملانے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس جماعت کو بھی یہ جرأت نہیں کہ پردہ سے باہر نکل کر کھلم کھلا وہ ڈھول پیٹنے لگے جو لندن کے اس قلندر کے گلے میں پڑا ہوا ہے۔ ہندوستان سر مائیکل کی ہاں میں ہاں ملانے والے "آنکھ" والی منطق کی مہملیت سے بخوبی واقف ہے اور کم از کم مسلمان تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ ان کے تعلقات کی روز افزوں کشیدگی اور آئے دن کے خون ریز فسادات کی تہ میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کی تجویز کی ہوئی اصلاحات نہیں بلکہ کچھ اور ہی اسباب ہیں جن کی فتنہ سامانیاں ارباب نظر سے مخفی نہیں۔

روزنامہ "زمیندار"

۱۲ جون ۱۹۲۷ء

جواہر ریزے

اڑے بادہ و مے کے مانند خود لو رے اڑے مجھ کو
میرا پیمانہ ساقی اس شراب تبریز سے بھر دے

نہ اس سے ڈر کہ ہوگا دوسرا ساغر خمار آور
اسے اک اور صہبائے جنوں انگیز سے بھر دے

ابھی چھلکا نہیں ہے اور بھی دو چار گھونٹ آئیں
پیالہ میری دولت کا خمِ عطر انگیز سے بھر دے

اگر خم خانہ خالی ہو چکا ہے تشنہ سے طالب کا
تو اٹھ اور ایک کنٹر آتشیں سبو کی نہر سے بھر دے

التماس ہے صبح دلدار سے بہرہ اگر تجھ کو
ملفوف کے کچھ شیراز او عنبر ریز سے بھر دے

پلا کر بادۂ رنگیں مرے سونے شبستاں کو
پریرویان فرخ و غمزہ لب پرویز سے بھر دے

دلوں پہ تخم عشق و تسبیح کے ڈال کر ڈورے
مشام جاں کسی کی زلف عنبر بیز سے بھر دے

اگر کرنی ہو گل چینی گلستان معانی میں
تو دامان خیال اس خامۂ گل ریز سے بھر دے

اِس نظم میں جس شعر کا قافیہ تبریز ہے اس میں ایک تلمیحی رمز چھپی ہوئی ہے۔ حکیم ہمام تبریز کے ایک نغز گو سخن سرا ہیں۔ جنہوں نے سعدی شیرازی کا زمانہ پایا ہے۔ ایک مرتبہ سعدی کو تبریز جانے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ ہمام سے ملاقات کرنی بلحاظ معاصرانہ تعلقات کے ضروری تھی اس لئے سعدی اُن کے مکان پر گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ حمام حمام کرنے گئے ہیں۔ سعدی وہیں پہنچے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ صرف شہرتِ کلام واسطۂ شناسی تھی لیکن سعدی نے حمام میں داخل ہوتے ہی ایک حمامی سے حکیم ہمام کا نام و نشان پوچھ لیا تھا۔ اس وقت ہمام ایک لنگ باندھے بیٹھے تھے اور ان کا خوش جمال لڑکا ان کے قریب اس وضع سے کھڑا تھا کہ ہمام اس کے اور سعدی کے درمیان بطور حجاب حائل تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہمام کو جب نووارد اجنبی کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ وہ شیراز سے آیا ہے تو پہلے تو سعدی کے حالات دریافت کئے اور پھر باتوں باتوں میں پوچھا کہ آیا اہل شیراز میرے کلام کو بھی پسند کرتے ہیں؟

سعدی نے جواب دیا کہ آپ کے اشعار وہاں بچے بچے کی زبان پر جاری ہیں۔ ہمام نے کہا بھلا ان میں سے کوئی شعر تو سنا بیٹے۔ سعدی نے لڑکے کی طرف دیکھ کر یہ مشہور مقطع پڑھا۔

در میان من و دلدار حجاب است ہمام
دارم امید کہ آں ہم ز میاں برخیزد

دنیائے شعر میں ایسا ستم ظریف بذلہ سنج اس وقت بجز سعدی کے اور کوئی نہ تھا۔ ہمام پھڑک گئے اور جھٹ پوچھا کہ کیا آپ سعدی تو نہیں ہیں۔ اور جب انھوں نے اپنی شخصیت کا اعتراف کیا تو بے تحاشا ان سے بغل گیر ہوئے اور لڑکے کو ان کے قدموں پر ڈال دیا۔

ہندوستان نے کالی داس کے بعد بھاشا میں سور داس اور تلسی داس سے بڑا کوئی شاعر نہیں پیدا کیا۔ آسمان شعر کے یہ دونوں چمکتے ہوئے تارے جلال الدین اکبر کے معاصر ہیں۔ اور مغربی مبصروں نے جن کے نزدیک کسی مشرقی سخنور کی بڑی سے بڑی عزت یہی ہو سکتی ہے کہ اسے اسپنسر یا شیکسپیر کا ہم پایہ قرار دیا جائے سور داس کو نغز گوئی میں اسپنسر کا مثیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ مسٹر گریرسن جنھوں نے اپنی ساری عمر سنسکرت اور ہندی لٹریچر کی تنقیح و تنقید میں گزاری ہے یہی خیال رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سور داس کو اسپنسر سے نسبت دینا آفتاب کو مشعل دکھانا ہے۔ سور داس کی "سور ساگر" میں تو خیر ساٹھ ہزار شعر ہیں اس کے ایک شعر پر بھی اسپنسر کی ساری "فیری کوئین" نثار ہے۔

سور داس نے سری کرشن کے عشق کی شراب پی رکھی ہے۔ اور اسے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اپنے محبوب دل آرام ہی کا دھیان رہتا ہے۔ روایت کہتی ہے کہ اس پر دردناک اشعار کی روانی اور بے ساختہ پن میں سری کرشن کا فیض روحانی اسی

طرح ملا ہوا ہے جس طرح گلاب میں خوشبو لسی ہوتی ہے وہ خود نما بنا ہے اور لکھ نہیں سکتا۔ اس لئے گرشن اس کے لئے کتابت کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کا پینک بال برق سے بھی زیادہ تیز پا ہے اور اس کے انقلاب گرمدیں ابر تو بہار کو بھی خبر ملتی ہیں۔ لیکن آسمانی کاتب کا قلم اور بھی زیادہ سریع السیر ہے۔ اس لئے وہ اپنے خریدار پر ناز کرتا ہوا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے کر فرار کا ہوا چلے۔ لیکن سری کرشن اس کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اس پر سور داس ناز و نیاز کی تصویر اس دلفریب دلربا و دل گداز شعر میں کھینچتا ہے۔

بانہہ چھڑائے جات ہو نبل جان کے موئے

ہر دے میں سے جاٹیو تو مرد بدوں گی توے

(مجھے کمزور و ناتواں سمجھ کر تم نے ہاتھ چھڑا لیا اور بچ گئے ہیں تمہاری بہادری جب جانوں کہ الفت کے جو ڈورے میرے دل نے تمہارے تصور پر ڈال رکھے ہیں ان کو بھی تڑا سکو)

ماہ نخشب کی کیفیت کسی دوسری جگہ سپرد قلم کی گئی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کو اگرچہ گیارہ سو سال سے اوپر ہونے کو آتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی علم و حکمت کا یہ کرشمہ اس دماغی تفوق کی ایک روشن نشانی سمجھا جا سکتا ہے جو ایشیا کو ابتدائے زمانہ تاریخ سے سولھویں صدی عیسوی تک دوسرے اقطاع عالم پر حاصل رہی لیکن جب ہم اس سے بھی چار سو سال پہلے ہندوستان میں یہاں کے صناعوں کو لوہا ڈھالنے کے فن میں یہاں تک کمال دیکھتے ہیں کہ وہ لوہے دو دو سو من وزنی اور سات سات گز اونچی لوہے کی لاٹ ایک ہی سانچے میں ڈھال لیتے تھے تو ہمیں مشرقی ہونے پر فخر کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

اس لاٹ کو ہر شخص نے جسے دہلی جانے اور قطب صاحب کی سیر کرنے کا اتفاق

ہوا ہے دیکھا ہوگا کہ لوہے کا ایک سالم ڈھلا ہوا مینارہ ہے جو زمین کے بیچ میں بقدر ایک فٹ آٹھ انچ کے پیوستہ ہے۔ اور سطح زمین سے اس کا ارتفاع پورے بائیس فٹ ہے اس کے وزن کا اندازہ ایک سو اڑسٹھ من تخمینہ کیا گیا ہے۔ مسٹر ویلنٹائن بال جنہوں نے ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک ضخیم و جسیم کتاب لکھی ہے بیان کرتے ہیں کہ آج سے چند سال پیشتر دنیا کے بڑے سے بڑے لوہے کے کارخانوں میں اتنے بڑے ڈھلے ہوئے آہنی مینارے کا تیار ہو سکنا نا ممکن تھا اور اب بھی بہت ہی کم کارخانے ایسے ہیں جہاں ایسا بڑا سانچہ موجود ہو کر ایسی لاٹ کو ڈھال سکے۔

ماہرین فن آثار قدیمہ بتلاتے ہیں کہ یہ لوہے کی لاٹ چندر گپت ثانی کے بیٹے کمار گپت اول نے ۴۱۵ء میں نصب کی تھی۔ اس پر ایک کتبہ بخط سنسکرت منقوش ہے جس کا مسٹر ونسنٹ سمتھ نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"وشنو دیوتا کا یہ اونچا نشان وشنو پہاڑی پر راجہ چندرا نے جو وشنو مت کا پیرو تھا نصب کیا تھا۔ اس راجہ کا چہرۂ حسن میں چندرا (ماہ کامل) کے مشابہ تھا۔ اس نے محض اپنی قوت بازو سے یہ عظیم الشان سلطنت پیدا کی اور اس کو مدتوں اپنے قبضہ میں رکھا۔ اور اگرچہ شاید تھک جانے کے باعث اس کا جسم اس دنیا سے رخصت ہو کر دوسری دنیا میں چلا گیا ہے کہ اس پر بھی اپنے نیک کاموں کی وجہ سے اس کے تسلط بٹھا لیا ہے۔ تاہم ان چنگاریوں کی طرح جو کسی بڑے آتش زدہ جنگل کی کھائی ہوئی آگ کی راکھ میں دبی ہوئی ہوں اس کی دشمن کش توانائی کا شعلہ ابھی تک اس دنیا میں لپک رہا ہے۔ اس کی قوت بازو کی نسیم ابھی تک جنوبی سمندروں میں چل رہی ہے دریائے سندھ کے سات دہانوں کو عبور کر کے اس نے ویم ولیکا (غالباً بلوچستان سے مراد ہے۔ مترجم) کو شکست دی۔ اور جب علاقہ ونگو (بنگال) میں اپنے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے اس نے ان کی متفقہ فوجوں کو تباہ کیا تو اس کی تلوار کی کاٹ نے ان کے بازو پر اپنی شہرت کا نقش کھینچ دیا۔

چند دن ہوئے ایک مطبوعہ تاریخی تالیف موسوم بہ "واقعات ہند" ہماری نظر سے گذری جس کا آدھا سرورق پھٹا ہوا تھا۔ لیکن جو نصف باقی تھا اس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کو مولوی کریم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر حلقہ لاہور۔ ماسٹر رام چندر صاحب مدرس ریاضی مدرس دہلی اور رئیس اور بزرگوں کی متفقہ قابلیتوں سے مرتب کیا تھا۔ مطبع کا نام جہاں یہ کتاب چھپی ہے "مطبع جلوہ نور لاہور ہے"۔ لیکن سن انطباع معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً سن ۱۸۶۰ء اور سن ۱۸۷۰ء کے درمیان چھپی ہے۔

محمود غزنوی کے حالات مولفین نے بڑی تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں اور اس میں بہت کچھ داد تحقیق دی ہے۔ مثلاً دربار غزنین کے مشاہیر شعرا اہل کمال کا ذکر کرتے ہوئے ابو ریحان بیرونی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس کو ہاموں رشید نے بغداد سے محمود غزنوی کے پاس بھیج دیا تھا اور وہ اس بادشاہ کی رفاقت میں رہتا تھا"۔ میر کریم الدین اینڈ کو نے محمود غزنوی کو ہاموں الرشید کا معاصر قرار دے کر اپنی تاریخی قابلیت کا جو کرشمہ دکھایا ہے اسے دیکھ کر ہمارے دل میں بے اختیار ایک سخن سنج بزرگ کی یاد تازہ ہو گئی جن سے یاروں نے فرمائش کی کہ سعدی کا کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنائیے تو آپ نے جھوم کر کہا۔

چہ خوش گفت ست سعدی در زلیخا
الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

لیکن میر کریم الدین بیچارے بھی ایک لحاظ سے سچے ہیں۔ مدرسہ کے لڑکوں کے لئے تاریخ کی ایک کتاب لکھنی تھی۔ انگریزی میں اچھا خاصہ مواد سامنے ہی میز پر رکھا ہوا تھا۔ ماسٹر رام چندر ترجمہ کے لئے موجود تھے۔ مولوی محمد ضیاء الدین آسان تعلیم کے ایک اور چمکتے ہوئے تارے سے نظر ثانی کرنے والے تھے۔ پھر ڈیڑھ سو صفحہ کی ایک مجلد کا تیار کر لینا کون سی بڑی بات تھی۔ انگریزی تاریخوں میں درج تھا کہ دربار مامون سے ابو ریحان بیرونی دربار محمود غزنوی میں منتقل کر دیا گیا۔ میر کریم الدین اور ان کے فضیلت

انتساب فخر کلکتے نے یہ سمجھ کر کہ مامون سے مراد مامون عباسی ہے اپنی طرف سے تھوڑا سا نمک مرچ لگا کر مامون کو مامون الرشید اور دربار کو دربار بغداد لکھ مارا۔ حالانکہ اگر ذرا بھی نظر وسیع ہوتی اور اگر نظر وسیع نہ ہوتی تو ذوق سلیم ہی تھوڑا بہت حصے میں آیا ہوتا تو وہ یہ سوچتے کہ مامون الرشید تو محمود غزنوی سے دو سو سال پہلے گذر چکا ہے۔ پھر وہ بیرونی کو محمود کے پاس کیونکر بھیج سکتا ہے۔ یہ مامون کوئی دوسرا ہی تاجدار ہوگا۔

جس مامون کو "واقعات ہند" میں مامون الرشید ظاہر کرنے سے چشم انتظار میں نشتر لگایا گیا ہے۔ وہ اصل مامون ابن مامون فرمانروائے خوارزم تھا جس کے علاقہ کو محمود غزنوی نے سنہ ۱۰۱۷ء میں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ غزنین کی طرح خوارزم بھی دنیائے اسلام کا ایک شاندار علمی مرکز تھا۔ ابوسہل مسیحی جیسے فلسفی ابونصر عراقی جیسے مہندس ابوالحسن خمار جیسے طبیب اور بوعلی سینا و ابوریحان بیرونی جیسے مشاہیر عصر دربار خوارزم کی زینت تھے۔ مسلمانوں کی کشور کشایانہ سرگرمیوں کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ زخار فدہ بیوی کے غنائم پر انہوں نے علمی لوٹ کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔ اور کیوں نہ رکھتے جبکہ ان کے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اقدس ہے۔

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

سومنات کی روایتی دولت سے خوارزم کا علمی خزانہ محمود کی نگاہ میں زیادہ قیمتی تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۰۱۶ء میں اس نے اپنے دربار کے ایک امیر حسین ابن علی ابن میکائیل کو مامون خوارزم شاہی کے نام ایک چٹھی دے کر بھیجا جس کا مضمون حسب ذیل تھا۔ "میں نے سنا ہے کہ دربار خوارزم شاہی میں علما و فضلا کی ایک کامل الفن جماعت موجود ہے جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتائے روزگار ہے۔ ان سب کو غزنیں بھیج دیا جائے تاکہ انہیں بھی میرے دربار میں حضوری کی عزت حاصل ہو اور ان کے علم و ہنر سے میں مستفید

ہو سکوں۔ امید ہے کہ فرمانروائے خوارزم میری اس التماس کو از راہ کرم قبول فرمائیں گے"

یہ پیام اگرچہ استدعا کی شکل میں بھیجا گیا تھا، لیکن حقیقت میں ایک فرمان واجب الاذعان تھا۔ اور مامون بھی اس تلخ حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ان تمام مشاہیر کو جن کے نام محمود کے مراسلہ میں درج تھے جمع کر کے کہا کہ سلطان کی قوت بڑی زبردست ہے۔ اس کے لشکر جرار میں خراسان و ہندوستان کا جہان کتنا منحصر متال ہے۔ خوارزم پر بھی اس کا دانت ہے۔ ایسی حالت میں میں کس طرح اس کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہوں۔ اب آپ لوگ بتائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ حقیقت حال سے آگاہ ہو کر البیرونی خمار[۳۱] اور عراق تو غزنیں جانے پر رضامند ہو گئے اس لئے کہ سلطان محمود کی فیاضی کا شہرہ ان کا اویزہ گوش ہو چکا تھا۔ لیکن بوعلی سینا اور مسیحی نے وہاں جانے سے ہاتھ کانوں پر دھرا اور مامون کے انماض کی آڑ میں راتوں رات خوارزم سے فرار ہو گئے۔

چونکہ پروفیسر براؤن کا ماخذ خود البیرونی ہے جس کے متعلق ستارہ صبح کی کسی گذشتہ اشاعت میں ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ وہ محمود کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ اور "کتاب الہند" میں اس نے جابجا محمود کی منقصت کی ہے۔ اس لئے اس کے منہ سے محمود کی "فیاضی" کا اعتراف سن کر ہمیں اس ہزار سالہ افسانہ کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ محمود نہایت بخیل اور کنجوس تھا۔ تاریخ کے صفحات چشمہ کوثر سے بارہا گدلا گیا ہے۔ محمود کی قدردانی علم و فن اور اس کے دربار کی شان ایثار کو فردوسی کے ایک شعر نے ثریا سے ثریٰ میں پہنچا دیا۔

اگر مادر شاہ بانو بدے

مرا سیم و زر تا بزانو بدے

عروضی سمرقندی نے اپنے دل کشا تذکرہ "چہار مقالہ" میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اگر ایک طرف ان اسباب پر روشنی پڑتی ہے جو البیرونی اور محمود کی کشیدگی کا باعث ہوئے تو دوسری طرف محمود کی دنائت طبع اور بخل و امساک کی فرضی روایتوں کی بھی قلعی کھل جاتی ہے۔

خوارزم سے رخصت ہو کر البیرونی غزنین پہنچ چکا تھا اور محمود کے حلقۂ مقربین میں داخل کر لیا گیا تھا۔ محمود اس کے کمالات علمی کا قائل تھا۔ لیکن علم نجوم کو اس حیثیت سے کہ یہ علم امور غیبیہ پر اطلاع پانے اور واقعات آئندہ کی نسبت حکم لگانے کا ذریعہ ہو سکتا ہے اسلامی تعلیم کے لحاظ سے باطل سمجھتا تھا۔ ایک دن اس نے بیرونی سے از راہ تعریض کہا کہ اگر تم ایسے ہی بڑے کواکب شناس ہو تو بھلا یہ تو بتاؤ کہ میں اپنے محل کے کس دروازہ میں سے باہر جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ البیرونی نے اس سوال کا جواب اپنے علم یا فراست سے لکھ کر ایک تکیہ کے نیچے دبا دیا۔ ادھر سلطان محمود محل کی ایک دیوار میں سوراخ کرا کر دروازہ کی بجائے اس سوراخ میں سے باہر نکلا۔ اور جب البیرونی کی پیشین گوئی کو منگا کر دیکھا تو یہ عبارت ملی جس سے اس کے غصہ کی انتہا نہ رہی کہ سلطان محل کے چاروں دروازوں میں کسی میں سے برآمد نہ ہوں گے بلکہ مشرقی دیوار میں ایک روزن نکلوا کر باہر تشریف لے جائیں گے۔ محمود البیرونی کے نجوم کو باطل کرنے پر تلا ہوا تھا اس لئے اس نے حکم دیا کہ اسے چھت سے نیچے گرا دیا جائے۔ لیکن چونکہ اسے البیرونی کی جان لینی منظور نہ تھی اس لئے ملازموں کو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی کہ نیچے ایک پردہ تان دیا جائے تاکہ یہ اس پر گرے اور اس کی ہڈی پسلی نہ ٹوٹے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

جب البیرونی کپڑے جھاڑ کر محمود کے سامنے حاضر ہوا اور اس سے پوچھا گیا کہ کیا تمہارے نجوم نے تمہیں اس افتاد کی بھی اطلاع دے دی تھی جو اب تم پر پڑی ہے تو اس نے جھٹ جیب سے ایک پرچہ نکال کر سلطان کے سامنے رکھ دیا۔ اس پرچہ میں لکھا ہوا تھا۔ کہ آج میں ایک بلندی پر سے گرایا جاؤں گا لیکن زمین پر سلامتی کے ساتھ

پہنچوں گا - اگر کوئی اور اوہام پرست شخص ہوتا تو اس دونوں پیشین گوئیوں کو پورا ہوتا دیکھ کر اگر ابوریحان کی رسالت کا نہیں تو اس کے نجوم کا تو ضرور قائل ہو جاتا لیکن محمود نے ان کو بخت و اتفاق پر محمول کر کے ابوریحان کو قید کر دیا تاکہ شریعت پر بطلان پرستی غالب نہ آئے - چھ مہینے ابوریحان نے قید میں گذارے - آخر صدر اعظم احمد بن حسن المیمندی کی سفارش پر وہ رہا کیا گیا اور جب دربار میں آیا تو محمود نے اسے ایک برق رفتار گھوڑا جو طلائی ساز و یراق سے آراستہ تھا - ایک شاہانہ خلعت، ساٹن کا ایک مکلف عمامہ ایک ہزار اشرفیاں - ایک غلام اور ایک مہ جمال کنیز عطا کی - اگر اسی کو بخل کہتے ہیں تو محمود بے شک بڑا ہی کنجوس اور مکھی چوس تھا -

حدائق السحر میں رشید الدین وطواط نے ایک بڑا مزے کا لطیفہ لکھا ہے جس کے لطف میں ہم اپنے ناظرین کو شریک کئے بغیر نہیں رہ سکتے -

ایک بذلہ سنج عرب شاعر کو ایک مرتبہ ایک کانے درزی سے کپڑے سلانے کا اتفاق ہوا - جس کا نام عمرو تھا - کپڑے کا تھان درزی کو حوالہ کرتے وقت دفعۃً شاعر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی - اور آپ نے فرمایا کہ بھئی اگر تم اس کپڑے سے میرے لئے ایک ایسا لباس سی دو جو دیکھنے والوں کو حیران کر دے اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ قبا ہے یا جبہ تو میں تمہاری شان میں ایک ایسا شعر تصنیف کرنے کا ذمہ لیتا ہوں جس کی نسبت بڑے سے بڑے ماہر کو دھوکا ہوگا - کہ یہ مدح ہے یا قدح - درزی صاحب بھی رنگین مزاج واقع ہوئے تھے - انہوں نے ایک تھیلہ سی کر شاعر کے حوالے کیا - اور کہا کہ لیجئے حضرت میں نے تو اپنی شرط پوری کر دی اب آپ فرمائیے کیا فرماتے ہیں - شاعر نے جھٹ کہا -

خاط لی عمرو قبا

لیت عینیہ سوا

عمرو نے میرے لئے ایک قبا تیار کی -

کاش اس کی دونوں آنکھیں ایک سی ہوتیں

اس ذو معنے شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کاش عمرو بینا ہوتا یعنی اس کی دونوں آنکھیں ضیائے بصارت سے مستنیر ہوتیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کاش اس کی دوسری آنکھ بھی اندھی ہوتی اور دونوں ہی دیدے پھوٹ گئے ہوتے۔ کلام عرب میں ہجو اکثر ایسی ہی لطیف ہوتی ہے۔ ایران نے اس لطافت کو عفونت انگیز کثافت سے بدل دیا۔ اور ہجو نگاری اچھی خاصی فحش گوئی ہو گئی۔

ہندوستان نے بھی ہجو گوئی میں ایران ہی کا تتبع کیا ہے۔ عمرو کو اس کی قبا دوزی کا صلہ اگر سودا سے ملتا تو ثقاہت کی شان مرزا رفیع صرف اس حد تک برقرار رکھ سکتے کہ

آیا ہے قرآن میں کَانَ مِنَ الْکَافِرِیْن

اس مصرعہ کو پڑھ کر ہمارے ذی بصیرت ناظرین کہیں تھان یکوّن کی گردان نہ کرنے لگ جائیں یہ تھان نہیں بلکہ کانا ہے۔ اور اس کانا کو بھی تھان کا تانا بانا نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ وہ صنف ہے جس سے غریب عمرو متصف تھا۔

۱۹۱۵ء کے ماہ اپریل کی پندرہویں تاریخ کو لندن کی "رائل سوسائٹی آف آرٹس" کے ایک اجلاس میں مسٹر پرسیول لینڈ ڈاؤن نے بصرہ و شط العرب کے طبیعی جغرافی اور تاریخی حالات پر ایک دلچسپ مضمون پڑھ کر سنایا تھا۔ جس کے جستہ جستہ مقامات کا اعادہ خالی از لطف نہ ہوگا۔

مسٹر لینڈ ڈاؤن کے دعاوی فن آثار قدیمہ کی جدید ترین تحقیقات پر مبنی ہیں بیان کرتے ہیں کہ شط العرب کا علاقہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے تین ہزار سال قبل سومر کی عظیم الشان سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ یہ سلطنت جو قدیم انسانی تمدن کا ایک گہوارہ تھی خلیج فارس کے ساحل تک پہنچی ہوئی چلی گئی تھی۔ اور اریدو اور لور اس کے دو بڑے بندرگاہ تھے۔ ان دونوں شہروں کا سمندر کے کنارہ پر واقع ہونا وتمی کی تحریری شہادت سے ثابت ہے جسے آثار قدیمہ نے مرد سومر کی فرسودگی

سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچا ہے سومگی فرمانروا تھے اور کاکا تب تھا جس نے ۲۳۵۰ء قبل مسیح کا زمانہ پایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے آقا کو اریدو کے ساتھ جو سمندر کے کنارے پر واقع ہے ایک خاص دلبستگی ہے اور اس کا مستقر یہی شہر ہے۔

اس کے چار صدی بعد یعنی ۱۹۵۰ء قبل مسیح کے قریب حمورابی تاجدار بابل نے جو ایک بہت بڑا واضع وجامع قوانین فرمانروا تھا یہ حکم جاری کیا کہ اس کی فوجیں بندرگاہ اُور سے جہازوں پر سوار ہوں۔ اس حکم سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے کوئی بحری مہم کسی غیر علاقہ کی تسخیر کے لئے بھیجی ہوگی وہاں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُور درحقیقت ساحل پر واقع تھا۔ اور پھر اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں خلیج فارس کا ساحل موجودہ ساحل سے بجانب شمال و شمال مغرب بہت آگے تھا۔ اور جہاں آج خشکی کا عمل ہے وہاں ان دنوں آب شور موجیں مارتا تھا۔

آگے چل کر مسٹر لینگڈن ہمیں بتاتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُور کے رہنے والے تھے اور یہیں سے آپ نے حمورابی کے حکم مذکورہ کے نفاذ کی تاریخ کے قریب ارض کنعان کی طرف ہجرت فرمائی۔ روایات نے ہمیں اس تصور کا خوگر بنا دیا ہے کہ حضرت ابراہیم کی زندگی بحری نہ تھی بلکہ رعایانہ تھی۔ لیکن اب یہ حقیقت نمایاں ہو چلی ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ریوڑوں کی رکھوالی کرنے والے شیخ قبیلہ کے لئے شبانی کا کام اور چراگاہوں کا تجربہ بالکل نیا تھا۔ جب اپنے والد تارہ کے ہمراہ اُور سے نقل مکان کر کے انہوں نے وہ سفر اختیار کیا جو دنیا کی لوحِ تاریخ پر ایک انمٹ نقش چھوڑنے والا تھا تو بھیڑوں کا ممیانا اور گائے بیلوں کا ڈکرانا ان کے کانوں کے لئے بالکل ہی آوازیں تھیں۔ اب تک ان کی زندگی ایک قدیم بندرگاہ میں بسر ہوئی تھی اور ان کا مشام نفط اور سمندر کی کائی کی بو اور ان کے

کان ملاحوں کی مختص الاصطلاح گفتگو ہی سے آشنا تھے۔

مسٹر لینیڈن کا بیان ایک بڑی حد تک کتاب مقدس کی روایت کے مطابق ہے۔ پیدائش کے گیارہویں باب کی ستائیسویں آیت میں حضرت ابراہیم کے باپ کا نام تارہ درج ہے۔ اور اکتیسویں آیت میں مذکور ہے کہ "تارہ نے اپنے بیٹے ابرام (ابراہیم) اور اپنے پوتے لوط یعنی اپنے بیٹے حاران کے بیٹے کو اپنی بہو سری (سارہ) اپنے بیٹے ابرام کی جورو کو لیا اور وہ ان کے ساتھ کسدیوں کے اُور سے روانہ ہوئے"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا زاد بوم اُور تھا۔ رہی یہ بات کہ ان کی زندگی دیہاتی تھی یا صحرائی۔ سو ماہرین آثار قدیمہ کے لئے جو اُور کو بندرگاہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہوں اس بات کا فرض کر لینا بہت ہی آسان ہے کہ اس شہر میں جس قدر لوگ آباد تھے وہ سب کے سب لوگ ملاح تھے اور بھیڑ بکریاں نہ رکھ سکتے تھے۔

موّرخین کے صحیفہ پیدائش کے گیارہویں باب پر نظر ڈالنے کے بعد جب ہم نے بارہویں باب کو پڑھنا شروع کیا تو ہمارا قدم اعتقاد ایک جگہ پھسلے بغیر نہ رہا۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد تارہ اپنے بھتیجے لوطؑ اور اپنی بی بی سارہ کے ساتھ اُور سے چل کر حران پہنچے تھے۔ جہاں ایک مدت تک آپ کا قیام رہا۔ وہاں سے وحی الٰہی کے بموجب آپ ارض کنعان کی طرف ہجرت کرنے والے تھے۔ پیدائش کے گیارہویں باب کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہو چکا تھا کہ تارہ کا سن جب ستر برس کا تھا تو ان کے صلب سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے (آیت ۲۶) جب اُور سے حضرت ممدوح اپنے والد کے ساتھ ہجرت کر کے وارد حران ہوئے تو ایک عرصہ کے بعد آپ کے والد کا دو سو پانچ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا (آیت ۳۲) اس سے معلوم ہوا کہ تارہ کے انتقال کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر ایک سو پینتیس سال تھی۔ اور اگر اپنے والد

کی وفات کے بعد ہی آپ نے کنعان کا رخ کیا ہو تو اس وقت آپ کا سن شریف ۔۔ بھی ہوگا۔ لیکن اس مقدس بزرگوں نے جن کے حصہ میں توریت کی تصحیف واشاعت کی متبرک خدمت آئی ہے۔ بارھویں باب کی چوتھی آیت میں ہمیں بتایا ہے کہ "ابراہیم جب حران سے روانہ ہوا پچھتر برس کا تھا" الانسان سے اگر اس قسم کی حسابی غلطی ہو جائے تو وہ قابل درگزر ہے اس لئے کہ وہ خطا و نسیان سے مرکب ہے۔ لیکن کسی صحیفۂ آسمانی میں ایسی کھلی ہوئی فرد گذاشت کا پایا جانا ایمان کو متزلزل کئے دیتا ہے

حضرت ابراہیم کا عقد حضرت سارہ سے اوائل ہی میں ہو چکا تھا (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۹) اور حضرت سارہ کی عمر بھی ایسی تھی کہ ان کے بطن سے اولاد پیدا ہو سکے جیسا کہ اسی باب کی تیسویں آیت سے مترشح ہوتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سارہ بانجھ تھیں اس لئے ضرور ہے کہ حران میں اپنے خسر کے انتقال کے وقت اگر اپنے خاوند سے وہ دس پندرہ سال چھوٹی بھی مان لی جائیں تو کم از کم ایک سو بیس سال کی ہوں یا اگر بارھویں باب کی چوتھی آیت ہی صحیح ہو اور حضرت ابراہیم کی عمر حران سے ہجرت کرنے وقت پچھتر ہی سال کی قرار دی جائے تب بھی حضرت سارہ کا سن ستر بہتر سال کا ہونا چاہئے اور یہ وہ عمر ہے جس میں رعنائی شباب اٹھ جاپے کی گوناگوں فرسودگیوں اور بدنمائیوں سے بدل چکی ہوتی ہے لیکن اس عجوزۂ یک صد و بست یا ہفتاد سالہ کی نسبت بارھویں باب کی دسویں، گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں آیت میں لکھا ہے۔

"اور ابرام مصر میں گیا کہ وہاں ٹھہرے کیونکہ ملک میں بڑا اکال پڑا تھا۔ اور جب مصر کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی جورو سرٰی کو کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے۔ اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کے کہیں گے کہ یہ اس کی جورو ہے سو مجھ کو مار ڈالیں گے اور تجھے جیتا رکھیں گے۔ تو کہیو کہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیرے

وسیلہ سے سلامت رہے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے برگزیدہ و مقدس بزرگ کی نسبت یہ ظاہر کرنا کہ آپ نے جھوٹ بول کر جان کے خوف سے اپنی زوجہ محترمہ کے حسن و جمال کی آڑ میں پناہ لی تھی اور اس عفیفہ کو اپنی بہن بنا کر مصریوں کے حوالے کر دیا تھا، خدا رسیدگی و ماموریت الہٰی کی ایسی مکروہ تصویر کھینچنا ہے جس کی طرف سے ہماری روحانیت منہ پھیر لینے پر مجبور ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس ادعا میں بھی وہی پریشان کن تواقض شامل ہیں جو حضرت ابراہیم کی عمر کے متعلق صحیفہ پیدائش کے گیارہویں باب کی چھبیسویں اور بارہویں باب کی چوتھی آیت میں ملے ہوئے ہیں۔ یہ وہ تکلیف دہ اختلافات ہیں جنہوں نے خود مسیحی و یہودی دنیا کے مفسرین کو ایک عقلی منغطہ میں ڈال دیا اور مسٹر چارلس انتھویل اپنے "نیو پاپولر انسائکلوپیڈیا" (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) میں حسب ذیل رائے کے اظہار پر مجبور ہوئے۔

"عبری تاریخ کی ایک بہت ہی بڑی مشکل اس کے سنین ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ کتاب مقدس کے مختلف صحیفوں میں واقعات کے سن بصراحت درج کئے گئے ہیں لیکن یہ سنین نہ اس زمانہ کے دوسرے تاریخی واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں نہ آپس میں لگا کھاتے ہیں"۔

اسلام نے جہاں انسانیت پر اور ہزارہا احسانات کئے ہیں وہاں ایک بہت بڑا احسان اس حقیقت کبریٰ کی تلقین سے بھی کیا ہے کہ پیغمبروں کی فطرت کبیرہ خطاؤں سے منزہ ہوتی ہے اور ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کی تصویر قرآن حمید نے بھی کھینچی ہے۔ لیکن قدوسیت کے اس مرقع میں اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ لقد اصطفینٰہ فی الدنیا وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین (ہم نے اس کو اس دنیا میں برگزیدگی عطا کی اور آخرت میں بھی اس کا شمار صالحین میں ہے)۔

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ دنیوی برگزیدگی کس قسم کی تھی تو سورہ انعام کی حسب ذیل آیات پڑھ لیجئے۔

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا و ما انا من المشرکین ه وحاجه قومه قال اتحاجونی فی الله و قد هدان ولا اخاف ما تشرکون به الا ان یشاء ربی شیئا وسع ربی کل شیئا علما افلا تتذکرون ه وکیف اخاف ما اشرکتم ولا تخافون انکم اشرکتم بالله ما لم ینزل به علیکم سلطانا فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون ه الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم اولئک لهم الامن وهم مهتدون

میں (ابراہیم) نے تو اسی سے لو لگائی ہے اور اسی کی طرف اپنا منہ کیا ہے جو آسمان و زمین کا بنانے والا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ اس پر جب ان کی قوم ان سے جھگڑنے لگی تو انہوں نے کہا کہ کیا تم مجھ سے خدا کے بارہ میں جھگڑتے ہو۔ وہ تو مجھ کو توحید کا سیدھا رستہ دکھا چکا اور جن کو تم اس کا شریک مانتے ہو میں ان سے مطلق ہراساں نہیں ہوں۔ ایک البتہ میرا پروردگار ہی ایسا ہے جو میرے نفع و نقصان پر قادر ہے اور اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ کیا تم لوگ اس سے نصیحت پذیر نہیں ہوتے؟ اور جن کو تم نے خدا کا شریک بنایا ہے میں ان سے کیوں ڈروں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ جن کو تم نے خدا کا شریک مان لیا ہے۔ ان کی اس شرکت کی کوئی دلیل تم پر نہیں اتاری گئی۔ ایسی حالت میں فریقین میں سے کس کو امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا زیادہ حق حاصل ہو سکتا ہے اگر تم عقل رکھتے ہو تو خود ہی سمجھ لو۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں بے انصافی کی آمیزش نہیں کی انہیں کو امن و اطمینان خاطر کا حق حاصل ہے اور وہی راہ راست پر ہیں۔

"مشرقی بنگال کے مسلمان" کے عنوان سے ہم نے کسی دوسری جگہ ایک مبسوط مضمون کے ترجمہ کی پہلی قسط درج کی ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر جیمز وائز نے لکھا تھا۔ اور ان کے انتقال کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے سنہ ۱۸۹۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے لکھنے سے ڈاکٹر صاحب کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ ان اسباب پر روشنی ڈالی جائے جنہوں نے صوبہ بنگال کے مشرقی حصہ میں اسلام کا عنصر غالب کر دیا۔ اور ایک یہ کہ اس اسلامی آبادی کے مروجہ عقاید پر جن میں اوہام باطلہ مخلوط ہو گئے ہیں ایک محققانہ نظر ڈالی جائے۔

مضمون کے حصہ اول میں ڈاکٹر صاحب نے کہیں کہیں ان دلائل سے کام لیا ہے جنہیں قسیسی حلقے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں ہنود کو بزور شمشیر مسلمان کیا اور بنگالہ میں جو کثیر تعداد توحید کی پرستش کرنے والوں کی نظر آتی ہے ان کا بیشتر حصہ جبراً حلقہ بگوش اسلام کیا گیا تھا۔ اگر اس الزام میں کچھ جان ہوتی تو ہم اسے بلا تامل تسلیم کر لیتے لیکن ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے دعاوی کی تردید اپنے ہی پیش کردہ واقعات سے کر کے زہر کے لئے تریاق بہم پہنچا دیا ہے۔ مثلاً اگر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اسلامی حکومت نے بنگال میں اسلام کو جبراً رواج دیا تو چند سطر کے بعد خود ہی فرما دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنگال میں ساڑھے پان سو سال سلطنت کی لیکن اس میں سے صرف سترہ سال کا زمانہ ایسا ہے جس میں انہوں نے ہندوؤں کو ترک مذہب پر مجبور کیا تھا۔ اور ہندوؤں کے لئے دو ہی چارہ کار رہ گئے تھے یعنی یا تو اسلام لائیں یا قتل کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ہندو وطن چھوڑ چھوڑ کر آسام اور کچھار کے جنگلوں میں سر چھپاتے پھرے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کے ایسے بڑے بڑے دعوے کا صریحی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ بنگال میں ایک بھی ہندو نظر نہ آتا اور ساری کی آبادی یا تو مسلمان ہوتی اور یا بنگال ایک بھائیں بھائیں کرتا ہوا ویرانہ ہوتا حالانکہ آپ کے

شمار و اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ اب بھی مشرقی بنگال میں نو فیصد کے قریب ہندو آباد ہیں۔ لہٰذا آپ کو آبادی میں اسلامی عنصر کے غلبہ کی توجیہ کے لئے کسی اور ... کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور وہ دلیل جو ... اصلی وجہ کے ہے آپ نے اسی ... ظاہر فرمائی ہے کہ قدیم الایام سے عربوں کے بنگال کے ساتھ وسیع تجارتی تعلقات قائم تھے اور عرب ... یہ اسلامی عقائد کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مگر دوسری بڑی حقیقی وجہ بنگال میں نشر اسلام کی آپ نے خود اسلام کی مساوات پسند اور جمہوریت نواز سچائی میں سے ڈھونڈ نکالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلام کو غلامی کا طعنہ دیا ہے۔ لیکن اس طعنہ کی کڑواہٹ میں اس نکتہ صحیح کی مٹھاس بھی ملا دی ہے کہ غلاموں کے ساتھ مسلمان شفقت اور ملاطفت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ غلام کے بال بچوں تک کی معاش کا کفیل اس کا آقا ہوتا تھا اور غلام اسلام کے کنبہ کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے اس حصہ کے اسقام و نقائص کی اصلاح ایک حد تک ... خود ہی فرما دی ہے اور اسی لئے ہم نے آپ کے مضمون کے لفظی ترجمہ کو اپنے ناظرین تک پہنچا دینے میں کوئی قباحت نہیں دیکھی۔

بنگال کی پنج صد و پنجاہ سالہ اسلامی حکومت کے دوران میں جبر ایذا فی الدین ڈاکٹر صاحب نے ستر سال کی مدت کے لئے جلال الدین سے منسوب کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اسی کے ضمن میں آپ یہ بھی تشریح کر دیتے کہ سنار گاؤں کی توحید کی انگیٹھی میں مذہبی حرارت کے کوئلے دہکا کر بنگالے والا یہ کون حکمران تھا جس نے بنگال بھر میں اسلام کی آگ لگا دی تھی۔ اگر آپ اس نکتہ صحیح کی زحمت بھی گوارا کرتے تو سعدی کے اس شعر کی ایک بڑے ہی مزے کی تفسیر ہو جاتی ؎

شنیدم غلامے کہ آب جو آرد

آب جوے آمد و غلام ببرد

یہ پردہ ہم اٹھائے دیتے ہیں۔ اور دو لفظوں میں بتائے دیتے ہیں کہ جلال الدین کون تھا۔ بنگال اور بہار کو بارہویں صدی کے آخیر میں بختیار خلجی نے مسخر کر کے یہاں لوائے توحید بلند کیا تھا۔ لیکن ایک صدی کے بعد اسلام کا سیاسی اقتدار ضعیف ہو گیا اور ہندوؤں نے ایک بڑی زبردست سلطنت یہاں پھر قائم کر دی۔ پندرہویں صدی کے شروع میں بنگال راجہ کنس کے زیر نگیں تھا۔ سنہ ۱۴۱۴ء میں جب وہ اپنے بیٹے راجہ جٹ مل کو وارث تاج و تخت چھوڑ کر راہگرائے عالم باقی ہوا تو اسلام کی مخفی قوتوں نے جٹ مل کے دل کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بارہویں صدی کے نصف آخیر میں برکہ خاں اور تکودار کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے اپنے تمام سرداروں کو جمع کر کے ظاہر کیا کہ میں تو ہندو دھرم چھوڑ کر دین اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لوگ میرے اس قصد میں مخل ہوں تو مجھے سلطنت کی بھی کچھ پروا نہیں۔ راج اپنے بھائی کو سونپ دوں گا اور خود اسلام لے آؤں گا کہ اسی میں میں اپنی نجات کا راز مضمر سمجھتا ہوں۔ سرداروں نے جواب دیا کہ ہمیں آپ کے عقیدے سے کچھ بحث نہیں۔ آپ شوق سے جو مذہب چاہے قبول کیجئے لیکن گدی پر بیٹھنے کے مستحق آپ ہی ہیں۔ غرض جٹ مل مشرف باسلام ہوا اور اپنا اسلامی نام اس نے جلال الدین محمد شاہ رکھا۔ اگر ڈاکٹر جیمز وائز کا یہ بیان صحیح ہے کہ مسند حکومت پر بیٹھتے ہی جلال الدین نے تلوار نیام سے کھینچ لی تھی اور اپنی تمام رعایا کو جبراً مسلمان بنا لیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ کیا ان کے کوئی ہم عقیدہ بزرگ ہمیں بتائیں گے کہ جس تلوار نے جٹ مل کو جلال الدین بنایا تھا وہ کس کے نیام سے نکلی تھی۔

ڈاکٹر وائز کا بیان ہے کہ ہندو قتل و زنا جیسے جرائم کبیرہ کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کے لئے اپنے گناہوں کی خمیازہ کشی سے بچنے کا یہی طریقہ تھا کہ اسلام قبول کر لیں۔ چونکہ اس بیان کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس اگر کوئی دلیل ہے تو وہ ایک دوسرے ڈاکٹر صاحب برنیر کا بیان ہے جنہوں نے شاہ جہاں کے

عہد میں چند جھوٹی سچی سماعی روایتوں کا طومار ہزلیات اپنے ذخائر سیر و سیاحت کے نام سے شائع کیا ہے اس لئے اس بیان کی تردید میں ہم اپنا اور اپنے ناظرین کا وقت اس ثبوت کی فراہمی سے ضایع نہیں کرنا چاہتے کہ وہ اور دو پانچ نہیں ہوتے

ڈاکٹر وائز کے مضمون کا دوسرا حصہ ایک آدھ تاریخی فروگذاشت سے قطع نظر کرنے کے بعد نہایت اہم ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمانان ہند عموماً اور مسلمانان بنگال خصوصاً اس کے ایک ایک لفظ کو توجہ سے پڑھیں۔ اس سے انہیں معلوم ہوگا کہ مسلمان جنہیں صرف خدائے واحد کے آگے سر عبودیت جھکانا چاہیے اور اسی کو اپنی تمام ضرورتوں اور حاجتوں کا کفیل سمجھنا چاہیے اسلام کی سچی اور سادہ تعلیم کو چھوڑ کر پیر پرستی اور قبر پرستی پر اتر آئے ہیں اور ایسی ایسی مشرکانہ رسوم انہوں نے اختیار کر لی ہیں جن کا اسلام میں نام و نشان تک نہیں ہے۔ مضمون کو لکھے ہوئے کچھ بہت زمانہ نہیں ہوا اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی رفتار ترقی بھی گذشتہ دس پندرہ سال میں ایسی نہیں رہی جس سے یہ امید پیدا ہو کہ انہوں نے اپنی حالت کی بہت کچھ اصلاح کر لی ہوگی۔ ڈاکٹر جیمز وائز نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی موجودہ حالت پر بھی صادق آتا ہوگا۔ کیا بنگال کے کوئی روشن خیال بزرگ ان مسائل پر جو ڈاکٹر وائز نے بحث کی ہے مزید روشنی ڈال کر ایک بہت بڑی قومی خدمت انجام دینے کے آمادہ ہوں گے؟ ڈھاکہ میں "ستارۂ صبح" متعدد ذی بصیرت حضرات کی نظر سے گذرتا ہے۔ ہم انہیں اس ضرورت کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔

ہمارے نکتہ رس مخدوم ابو الوفا مولانا ثناء اللہ صاحب نے اپنے گرامی قدر پرچہ "اہل حدیث" کی ۱۹ جنوری کی اشاعت میں چار صفحہ کا ایک لطیف افتتاحیہ "کانگریس اور مسلم لیگ" کے عنوان سے قلمبند فرمایا ہے۔ اس مضمون کی بنا سیاست سے

تو ہمیں کوئی سروکار نہیں ۔ البتہ تیسرے صفحہ کے دوسرے کالم میں مولانا نے "اظہار مسرت" کی بہت انتہا سرخی دے کر پنجاب اور پنجابیوں کی تعریف جس انوکھے انداز میں فرمائی ہے ۔ اس پر ایک ادبی نظر ڈالے بغیر ہم نہیں رہ سکتے ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "بہت عرصہ ہوا عرفی شاعر نے پنجاب کی تعریف میں ایک شعر لکھا تھا ۔

کہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بہ آبش حوض کوثر"

کیا خوب ہوتا اگر اس شعر کی تلاش میں شیراز کا دور دراز سفر اختیار کرنے کے بجائے مولانا امرتسر سے چل کر کنجاہ میں قدم رنجہ فرماتے اور مثنوی نیرنگ عشق میں نہ صرف اس شعر کو اپنی اصل شکل میں بلکہ اسی قسم کے متعدد اشعار کو ملاحظہ فرما لیتے جن میں غنیمت کنجاہی نے پنجاب کی تعریف میں قلم توڑ دیئے ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ندیدم کشورے غارت گرِ تاب ۔ بخوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور ۔ قسم خوردہ بہ خاکش حوض کوثر
بنائے کعبۂ دلہا ز خاکش ۔ عروج نشۂ معنی ز تاکش
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ ۔ رخِ خوباں بہ پیشش خط کشیدہ
زلالش بادہ سازِ مستیٔ عشق ۔ نسیمش روح بخش ہستیٔ عشق
ز شوق آں کہ تا آید بہ پنجاب ۔ دلِ کشمیر صد رہ مے شود آب
خنک آنکس کہ در ہنگام سرما ۔ دریں گلشن بود گرمِ تماشا

یہاں تک تو خیریت تھی لیکن مولانا نے حسب ذیل فقرہ تحریر فرما کر غضب ہی کر دیا ۔

"حضرت میاں صاحب مرحوم دہلوی پنجابیوں کے حق میں ایک شعر پڑھا

کرتے تھے جو ترمیم کے ساتھ یوں ہے۔

"جملۂ عالم ہمہ یک آبی اند　　فخر براں قوم کہ پنجابی اند"

معلوم نہیں یہ میاں صاحب مرحوم کون بزرگ ہیں جو یہ ہجو پڑھا کرتے تھے۔ کہ مولانا کی ترمیم سے پہلے "فخر براں" کی جگہ "آہ ازاں" کی شکل میں وہ ناپاک سے ناپاک گالی تھی جو پنجابیوں کے حق میں تصنیف کی جا سکتی تھی جیسا کہ ارباب ذوقِ سلیم سے مخفی نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا نے اہل پنجاب کی اس گھناؤنی ہجو پر فخر کس خیال سے کیا ہے۔

خاقانی نے اپنے استاد اور خسر ابو العلاء گنجوی کی ہجو کی تھی جس کا ابو العلا نے ایسا دندان شکن جواب دیا تھا کہ وہ اپنی سب شاعری و اخری بھول گیا تھا۔ اگر یہ حاجی صاحب جنہوں نے پنجابیوں کو "پنج آبی" کی گالی دی ہے۔ ہمارے سامنے موجود ہوتے تو ہم ابو العلا کے الفاظ میں ضرور ان سے کہتے۔

ہجو کسے مکن کہ ز تو بہ شود بسن
باشد کہ او پدر بود تو نہ دانیا

دوسری صدی قبل مسیح میں جب ہندوستان مہاتما بدھ کے عرفان کا حقیق جاں پرور پی رہا تھا "مہاوستو یدن" کے نام سے زبان سنسکرت میں ایک کتاب لکھی گئی تھی۔ جس کا موضوع یہ تھا کہ بادشاہ کے اقتدارات کا سرچشمہ کون سی طاقت ہے اور اس کے فرائض کیا ہونے چاہئیں؟ دو ہزار سال تک یہ کتاب زاویۂ خمول میں پڑی رہی۔ اس کنج گمنامی سے اب ایک فرانسیسی مستشرق موسیو ای سینار کی کنج کاوی نے روزِ روشن میں نکالا ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ نظامِ تمدن کے قائم ہو جانے کے بعد جماعت انسانی کو ایک ایسی زبردست شخصیت کی ان کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے کھیتوں کی حفاظت کرے۔ نیکوں کا ملجا و ماویٰ ہو۔

بدوں کو سزا دے۔ اور کھیتوں کی پیداوار کو مالکان اراضی کے درمیان بحصہ رسدی تقسیم کرے۔ جماعت کی طرف سے جب ایسے کسی شخص کا انتخاب ہو جاتا تھا تو وہ اسے "مہاسمتا" یعنی تمام جماعت کی طرف سے منتخب شدہ کا لقب دے کر پیداوار اراضی کا ایک چھٹوار حصہ اس کا حق سرداری قرار دیتی تھی۔ اس کے تین سو سال بعد ایک مصنف سوال کرتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ راجہ مغرور و متکبر ہو۔ وہ تو محض پرجا کا ایک نوکر ہے جس کی تنخواہ ملک کی آمدنی کے چھٹے حصہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ جمہوریت کا خیال مشرق میں اسلام سے بھی پہلے موجود تھا۔ اور حاکم بالکل مطلق العنان نہ ہوتا تھا جسے حکوموں کے جان و مال پر قطعی اور کامل اختیار بلا کسی ذمہ داری کے حاصل ہو۔ مقام عبرت ہے کہ مشرق کا قدیم لٹریچر اپنی اشاعت کے لئے اس سنہ ۱۹۱۷ء میں بھی مغرب کی محققانہ سرگرمی کا محتاج ہے۔ اور اہل ہند خصوصاً ہمارے ہندو بھائی اپنی قدیم کتابیں خود شائع کرنے کی بجائے فرانسیسیوں کے ممنون کش ہیں۔

مولوی سید ممتاز علی صاحب ایڈیٹر تہذیب النسواں لاہور کی طرف سے حال میں یہ تجویز پیش ہوئی ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب باعتبار ترتیب نزول مختلف ہے۔ حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ ترتیب نہ تھی۔ بلکہ یہ حضرات شیخین اور حضرت عثمانؓ کا ترتیب دیا ہوا قرآن ہے جس میں وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو ہونی چاہئے تھی اور اس لئے قرآن مجید کے ایک ایسے اڈیشن کی تیاری کی ضرورت ہے جس میں تمام سورتوں کو بلحاظ ترتیب نزول مدون کیا جائے۔

ہمارے دل میں مولانا کے فضل و کمال کی بہت بڑی وقعت ہے اور ان اصحاب میں جن کے علم و فضل پر اسلامی ہندوستان کو ناز ہو سکتا ہے۔ مولانا ایک اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن آپ نے اس انوکھی تجویز میں ایک ایسی جسارت سے کام لیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک کسی عالم دین کے حصہ میں نہیں آئی

جناب باری نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ یعنی ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا اور ہم خود ہی اس کے حافظ ہیں۔ قرآن مجید کی یہ حفاظت جس کا اس نص صریح میں حوالہ دیا گیا ہے آج تک مختلف طریقوں سے ہوتی چلی آتی ہے اور ایک طریقہ اس کا موجودہ ترتیب ہے جس کی آیات اور سورتوں اور پاروں کی تنظیم و تعین ہی ہے جو خدا اور اس کے رسول کو منظور تھی اور اس کی موجودہ شکل میں جو خدا اور رسول ہی کی قائم کی ہوئی ہے کسی انسان کو ردوبدل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

مولانا کا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حینِ حیات میں جمع و تدوین قرآن کی یہ شکل نہ تھی جو اب ہے۔ لیکن یہ آپ کا خیال ہی خیال ہے اور اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک کے خلاف قرآن کو ایک نئی شکل میں مدون کیا مزید دلائل کا محتاج ہے

ہم مانتے ہیں کہ سورہ اقرا سب سے اول نازل ہوئی تھی اور وہ قرآن مجید کے سب سے آخری پارہ میں درج ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر خدا اور رسولؐ کے مصالح اس امر کے مقتضی ہیں کہ کلام مجید کا افتتاح سورہ الحمد سے ہو تو قرآن مجید کی دلچسپی اور دلبستگی میں کون سا ایسا بڑا فرق آجاتا ہے جس کی اصلاح کی ضرورت مولانا سید ممتاز علی صاحب کو ایک ایسے اڈیشن کی تیاری سے محسوس ہو رہی ہے جو الحمد للہ رب العالمین کے بجائے اقرا باسم ربک الذی خلق سے شروع ہوتا ہے۔

"ستارۂ صبح"

۲۴ر جنوری سنہ ۱۹۱۷ء